اقبالیات

رموزِ بیخودی کی اشاعت کے سو سال پر خصوصی نمبر

جلد نمبر ۵۹	جنوری- جولائی ۲۰۱۸ء	شمارہ نمبر ۱، ۳

سرپرست: **عرفان صدیقی**

(مشیر وزیر اعظم برائے قومی تاریخ و ادبی ورثہ- صدر اقبال اکادمی پاکستان)

رئیس ادارت: **محمد بخش سانگی**

مدیر: **ڈاکٹر طاہر حمید تنولی**

نائب مدیر: **ارشاد الرحمٰن**

مجلس ادارت

پروفیسر فتح محمد ملک، افتخار عارف، ڈاکٹر عبدالخالق، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر معین نظامی، ڈاکٹر نعیم احمد، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر خالد ندیم، ڈاکٹر بقائی ماکان (ایران)، ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم (مصر)، ڈاکٹر سویامانے یاسر (جاپان)، ڈاکٹر خلیل طوق آر (ترکی)، ڈاکٹر عبدالحق (بھارت)

مجلس مشاورت

منیب اقبال، بیرسٹر ظفر اللہ خان، ڈاکٹر عبد الغفار سومرو، ڈاکٹر محمد اکرم اکرام، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر عبد الرؤف رفیقی، ڈاکٹر ایوب صابر، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سید جاوید اقبال، ڈاکٹر محمد عمر میمن (امریکہ)، ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ (جرمنی)، ڈاکٹر مستنصر میر (امریکہ)، ڈاکٹر جلال سوئیدان (ترکی)، ڈاکٹر تاش میرزا (ازبکستان)، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی (بھارت)

اقبال اکادمی پاکستان

مقالات کے مندرجات کی ذمہ داری مقالہ نگار حضرات پر ہے۔ مقالہ نگار کی
رائے اقبال اکادمی پاکستان کی رائے تصور نہ کی جائے۔

یہ رسالہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم و
فنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے جن سے انھیں دلچسپی تھی،
مثلاً: اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہب، ادب، آثاریات وغیرہ۔

سالانہ: دو شمارے اقبالیات (جنوری، جولائی) دو شمارے *Iqbal Review* (اپریل، اکتوبر)
ISSN: 0021-0773

بدل اشتراک

پاکستان (مع محصول ڈاک)	فی شمارہ: -/۱۵۰ روپے	سالانہ: -/۶۰۰ روپے
بیرون پاکستان (مع محصول ڈاک)	فی شمارہ: ۶ امریکی ڈالر	سالانہ: ۲۰ امریکی ڈالر

☆☆☆

تمام مقالات اس پتے پر بھجوائیں

اقبال اکادمی پاکستان
(حکومتِ پاکستان)
چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

Tel: [+92-42] 3631-4510
[+92-42] 9920-3573
Fax: [+92-42] 3631-4496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

مندرجات

❁ دیباچہ رموز بیخودی	علامہ محمد اقبال	۵
❁ رموزِ بیخودی پر ایک انتقادی نظر	سید سلیمان ندوی	۷
❁ مثنوی رموزِ بیخودی — تنقیدی نظر	سر عبدالقادر	۱۷
❁ مثنویات اقبال — اسرار و رموز	عبدالرحمٰن بجنوری	۲۷
❁ فلسفہ بیخودی		
رموزِ بیخودی کے تناظر میں مطالعہ	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۵۳
❁ علامہ اقبال کا فلسفہ بیخودی	مولانا عبدالسلام ندوی	۷۷
❁ مقدمہ شرح رموز بیخودی	یوسف سلیم چشتی	۸۱
❁ رموزِ بیخودی کے مباحث	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۹۳
❁ استحکام خودی اور اس کا ہشت گانہ دستور العمل	یوسف سلیم چشتی	۱۳۱
❁ رموزِ بیخودی — تبصرہ	پروفیسر اے جے آربری	
	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	۱۳۹
❁ رموزِ بیخودی کے مضامین کا ایک جائزہ	ڈاکٹر عبدالشکور احسن	۱۴۷
❁ رموزِ بیخودی — اجتماعی خودی کی تشکیل	ڈاکٹر عبدالمغنی	۱۶۳
❁ رموز بیخودی		
آغاز اور ترامیم و تحذیفات	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۱۹۱
❁ رموز بیخودی — مدعائے بیان	ڈاکٹر خضر یٰسین	۲۰۱

۞ رموز بیخودی — علامہ اقبال کے شعری سفر کا برزخی سنگ میل	ڈاکٹر طاہر حمید تنولی	۲۱۵
۞ رموز بیخودی— قیام واستحکام پاکستان	حسن رضا اقبالی	۲۳۹
۞ رموز بیخودی کا مطالعہ- مکاتیب اقبال کی روشنی میں	حسنین عباس	۲۶۳

دیباچہ رموزِ بیخودی

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے جس طرح حیاتِ افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعیینِ عمل و ذوق، حقائق عالیہ، احساس نفس کے تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل واقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہوجائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اُس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدِ نظر رکھ کر مَیں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص الہیّت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اُس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اُصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آچکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔

اُستاذی حضرت قبلہ مولانا مولوی سیّد میر حسن صاحب دام فیضہم پروفیسر مری کالج سیالکوٹ اور مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن خلداللہ ملکہ و اجلالہ میرے شکریے کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ ان دونوں بزرگوں سے بعض اشعار کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق قابلِ قدر مشورہ ملا۔ علیٰ ہذا

القیاس اپنے احباب میر نیرنگ، میرزا اعجاز اور مولانا عمادی کا بھی سپاس گذار ہوں کہ بعض مطالب کی تحقیق میں ان سے بھی مدد ملی۔

رموزِ بیخودی پر ایک انتقادی نظر

سید سلیمان ندوی

مدت سے ارادہ تھا کہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری پر ایک انتقادی نظر ڈالی جائے لیکن کثرت مشاغل اور قلت فرصت نے موقع نہ دیا۔ ابھی اُن کی ایک مثنوی رموزِ بیخودی موصول ہوئی ہے۔ اس تقریب سے اب خیالات کے عرض کا کسی قدر موقع مل گیا ہے۔

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا پبلک آغاز مخزن لاہور کے ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ رسالہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء کے قریب قریب نکلنا شروع ہوا تھا۔[1] اس لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کی پبلک شاعری کی عمر تقریباً ۱۶ برس ہے اور اس عرصے میں اُن کی متعدد چھوٹی بڑی نظمیں شائع ہوئیں جن میں سے اکثر کی اہلِ معنی نے داد دی اور بعض پر اہلِ ظاہر نے گرفت کی۔

ابتدا سے ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفرین واقع ہوئی ہے۔ کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لیے اُنھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں بھی نظمیں لکھیں، لیکن پھر وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے بلکہ اُن کی حیثیت ایک عام اُردو شاعر کے خیالات موزوں کی رہ گئی۔[2]

کائنات کے اسرار و حقائق کی تعلیم و تلقین کے لیے ہمیشہ سے چار راستے رہے ہیں: مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری۔ مذہب کی اصلی حیثیت ایک قانون اور فرمانِ شاہی کی ہے۔ اس کی پیروی اس لیے چاہیے کہ یہ خداوندِ عالم کا حکم اور فرمان ہے اور بندوں کو اس کی تسلیم سے چارہ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مصلحت اور حکمت پر بھی مبنی ہے۔ فلسفہ اپنی بنیاد دلائل اور براہین پر قائم کرتا ہے اور وہ انسان کی عقل اور دماغ کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تصوف انسان کے ذوقِ باطن اور لذّتِ وجدانی کو اپنا رہبر بناتا ہے اور شاعری مخاطب کے انسانی، قومی، اخلاقی اور مذہبی جذبات کے سہارے کھڑی ہوتی ہے۔

سچ بولنا انسانیت کا اصلی جوہر ہے لیکن یہ کہنا کہ سچ بولو کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ ہمیشہ سچ بولا کرو، یہ مذہب کی زبان ہے۔ سچ بولو، کیونکہ سچائی سے انسان کی عزت برقرار اور جماعت پر اس کا اعتماد قائم ہوتا ہے،

فلسفے کی بولی ہے۔ اور سچ بولو کہ سچائی سے دل میں ایک خاص قسم کی لذتِ نورانی حاصل ہوتی ہے، تصوف کی تعلیم ہے۔ اور سچ بولا کرو کہ تم اس قوم کے فرزند ہو جس نے صداقت اور راستی پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں، سچ بولو کہ فطرت ہمیشہ سچ بولتی ہے۔ پھول کی خوشبو کبھی ارادی غلطی سے اپنے کو بدو نہیں کہتی، روشنی اپنے آپ کو کبھی تاریکی نہیں کہہ سکتی، یہ دونوں شاعری کے محاورے ہیں۔[۳]

یہ مختلف راستے ہمیشہ سے الگ الگ تھے لیکن سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چند صدیوں کے بعد اسرائیلی پیغمبروں میں مذہب اور شاعری کی مخلوط راہیں نظر آتی ہیں۔ حضرتِ داودؑ کی مزامیر، حضرت سلیمانؑ کی غزلوں اور اخیر زمانے کے عبرانی پیغمبروں کے الہامی کلاموں میں، اور سب سے زیادہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مواعظ میں، مذہب اور شاعری دوش بدوش مصرفِ کار فرمائی ہیں۔

اسلام میں عربوں کا عنصر جب تک غالب رہا، یہ طریقے باہم مزج نہیں ہوئے۔ عجمیت کے اثر نے جو نتائج پیدا کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ تعلیم و تلقین کے یہ مختلف اُسلوب ایک صف میں آ کر انسان کو ہر راستے سے متاثر کرنے لگے۔ پہلے یہ تھا کہ انسان اپنے ذوق اور مناسبتِ طبع کی بنا پر اُن میں سے ایک راستے کو اپنے لیے انتخاب کر لیتا تھا لیکن عجم کے صوفیوں نے دیکھا کہ اس طریقے سے بہت کم تعداد ہماری گرفت میں آتی ہے۔ اُنھوں نے چاروں کو ملا کر ایک کر دیا تا کہ ہر مخاطب انسان ان میں سے کسی ایک پر ضرور ہے کہ سر ڈال دے گا۔

ہمارے خیال میں حکیم سنائیؒ پہلے شخص ہیں جو اس طریقۂ خاص کے موجد ہیں اور اس کے بعد مولانائے روم کے عہد میں یہ فن عروجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ مولوی رومی نے اپنے سات دفتروں میں سات آسمانوں کے خزانے یک جا کر دیے۔ اور چونکہ وقت کی چیز تھی اس لیے اہلِ معنی میں اس کی بے انتہا مقبولیت ہوئی اور اب بھی وہ مقبول ہے اور ایک حد تک اُس نے ملک و قوم کو فائدہ پہنچایا ہے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ چوتھی صدی سے لے کر دسویں صدی تک شعرائے باطن نے ہم کو جو کچھ سمجھایا، قرآن پاک اور حدیثِ قدسی کی جو کچھ تفسیریں اُنھوں نے کیں، ہمارے حاکمانہ غیظ و غضب، فاتحانہ جوش و خروش اور مجاہدانہ زور و قوت کو اعتدال پر لانے کے لیے وہ ضروری تھا۔

لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہمارے مشتعل قویٰ سرد ہو گئے ہیں، ہمارے خون کی گرمی محکومانہ برودت سے بدل گئی ہے اور ہمارے قویٰ میں مفتوحانہ ضعف آ گیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اُسی پُرانے نسخے کا استعمال جاری رہا تو بُردِ اطراف کے بعد شاید وہ بُردِ قلب کا باعث ہو جائے، اس لیے ضرورت تھی کہ ہمارے اہلِ دل شعرا مثنوی مولوی روم کا دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کر دیں۔

شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کے لیے چُن لیا۔ اُنھوں نے اس مقصد

کو پیشِ نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں: اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی۔ پہلی مثنوی میری نظر سے نہیں گزری، البتہ رداً اور اعتراضاً اس کے بعض بعض ٹکڑے اخبارات میں دیکھے۔ اس سفر میں مجھے محمد علی کی زبان سے اُس کے متعدد ابواب سننے کا موقع ملا۔ اُنھوں نے اس ذوق اور وجد کے ساتھ اس کے اشعار سنائے کہ میں سراپا اثر ہو گیا۔ شاعر نے جو کچھ کہا تھا اُس کو ایک بہتر مفسّر کی زبان سے سن کر خود بخود اُس کے اسرار و حکم کے عقدے وا ہونے لگے۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی ہے۔ یہ مثنوی چھوٹی تقطیع کے ۱۳۹ صفحوں میں عمدہ کاغذ پر اہتمام کے ساتھ چھپی ہے۔ زبان فارسی اختیار کر گئی ہے اور یہ شاید اس لیے تاکہ فوائد ہندوستان کی دیواروں تک محدود نہ رہیں، بلکہ دُنیا کی وہ تمام آبادی، جس کی حیاتِ ملی کو اس میں خطاب کیا گیا ہے، اُس کو سمجھ سکے۔

زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو اُن شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے، لیکن حق یہ ہے کہ اس لغزشِ مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں۔ مصرعوں کے در و بست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اُترے۔ شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفے، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں اور اس لیے اختلافِ مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا۔

زیرِ تقریظ مثنوی میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے اسرارِ خودی سے بہتر ہے۔[۵] اور اصل معنی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں مظاہرِ سیاست بیشتر اور اُس میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں لیکن منزلِ مقصود ایک ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، حکمائے ملت ان میں مسلمانوں کے مزاجِ قومی کی تشخیص نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے وہ صرف تین شخص ہیں؛ مولانا شبلی نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابوالکلام نے مجلدات الہلال میں اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی ان دو مثنویوں میں۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستے اوروں پر بھی مکشوف ہو رہے ہیں۔

رموزِ بیخودی ہے جس کا اصل مقصود ''ملتِ اسلامیہ کے اسرارِ حیات کی تشریح'' ہے، حسبِ ذیل عنوانوں پر منقسم ہے۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کی راہِ ترقی کے حسبِ ذیل منازل ہیں:

(۱)	افراد اور قوم میں باہمی نسبت۔

(۲)　قومیت کی پیدائش، افراد کی اجتماعی کیفیت سے ہوتی ہے اور اجتماعی کیفیت صرف نبوت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے اور یہی یقین منتشر افراد کو ایک سلسلے میں منسلک کر دیتا ہے۔

(۳)　ملت اسلامی کے اساسی ارکان میں سے پہلا رکن توحید ہے اور توحید کے معنی ہیں ایک ذاتِ برتر کے آگے اپنے کو ہیچ اور بے مقدار جان کر تمام دُنیا سے بے خوف اور نڈر ہو جانا۔

(۴)　جس طرح ایک فرد کے لیے آخری لمحہ حیات وہ ہے جب وہ اپنے وجود سے مایوس اور نا اُمید ہو جائے، اسی طرح قوموں کی زندگی کے خاتمے کا دن وہ ہے جب وہ اپنی قومی زندگی سے نا اُمید اور مایوس ہو جائیں۔ مسلمانوں کی قوم میں آج جو افسردہ دلی اور موت سے نظر آتی ہے وہ اسی طرح کے حزن و ملال اور یاس کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کو یہ چیزیں اپنے دل سے صاف نکال دینی چاہیں اور اس میں کامیابی صرف تکمیل ایمان سے ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید کی آیتِ مبارکہ لا تقنطوا من رحمة الله[۶] اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی لیے لا تخف ولا تحزن[۷] اور مسلمانوں کی لا خوف علیهم ولا هم یحزنون کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۵)　ملت کا دوسرا رکنِ اساسی اقرارِ رسالت ہے اور بغیر اس کے، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے، قومیت کا شیرازہ نہیں بندھتا۔

اس کے بعد شاعر نے نہایت عمدہ پیرایہ قصص و حکایت میں حسبِ ذیل امور کی تشریح کی ہے:

۱-　حکایتِ بوعبیدہ و جاپان در معنیٰ اخوتِ اسلامیہ۔

۲-　حکایتِ سلطان مراد و معمار در معنیٰ مساواتِ اسلامیہ۔

۳-　در معنیٰ حریتِ اسلامیہ و سرِ حادثۂ کربلا۔

۴-　در معنیٰ اینکہ چوں ملتِ محمدیہ مؤسس بر توحید و رسالت است، پس نہایتِ مکانی ندارد (یعنی اس کی جغرافی تحدید نہیں ہوسکتی بلکہ تمام دُنیا اس میں شامل ہوسکتی ہے)۔

۵-　در معنیٰ اینکہ ملتِ محمدیہ نہایتِ زمانی ہم ندارد کہ دوامِ ایں ملتِ شریفہ موعود است (اس کے یقین سے مسلمانوں کا حزن و یاس دور ہوگا)۔

۶-　در معنیٰ اینکہ نظامِ ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئینِ ملتِ محمدیہ قرآن است۔

۷-　در معنیٰ اینکہ پختگیٔ سیرتِ ملیہ از اتباعِ آئینِ الٰہیہ است۔

۸-　در معنیٰ اینکہ حسنِ سیرتِ ملیہ از تادب باداب محمدیہ است۔

۹-　در معنیٰ اینکہ حیاتِ ملیہ مرکزِ محسوس می خواھد و مرکزِ محسوس ملتِ اسلامیہ بیت الحرام است۔

۱۰-　در معنیٰ اینکہ جمعیتِ حقیقت از محکم گرفتنِ نصف العینِ ملیہ است، ونصب العینِ اُمتِ محمدیہ

حفظ ونشرِ توحید است۔

۱۱- در معنیٰ اینکہ توسیع حیاتِ ملیہ از تسخیر قوائے نظامِ عالم است۔

۱۲- در معنیٰ اینکہ کمالِ حیات ملیہ این است کہ ملت مثلِ فرد احساسِ خودی پیدا کند و تکمیلِ ایں احساس از ضبطِ روایاتِ ملیہ ممکن گردد۔

۱۳- در معنیٰ اینکہ بقائے نوع از اُمومت است وحفظ واحترامِ امومت اصلِ اسلام است۔

۱۴- در معنیٰ اینکہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرؓا اسوۂ کاملہ است برائے نسائے اسلام۔

۱۵- خلاصہ مطالبِ مثنوی در تفسیر سورۂ اخلاص۔

شاعر نے ان مطالبِ پانزدہ گانہ میں سے ہر ایک کو واقعات، حکایات اور آیاتِ قرآن اور حدیث سے محکم کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیتیں نہایت خوبی سے اس انگشتری کا نگینہ بنتی چلی گئی ہیں۔ جہاں تک ہمارے مطالعے نے کام دیا ہے، احادیث میں دفعہ ۱۴ کے علاوہ اور تمام واقعات صحیح ماخذوں سے لیے گئے ہیں۔ مثنوی کے ابتدائی ابیات، جن کا عنوان ''پیش کش بحضورِ ملتِ اسلامیہ'' ہے، یہ ہیں:

اے ترا حق زبدۂ اقوام کرد
ختم بر تو دورۂ ایتام کرد
اے مثالِ انبیاء پاکانِ تو
ہمگرِ دلہا، جگر چاکانِ تو
اے بعشقِ دیگراں دل باختہ
جلوہ ہائے خویش را نشناختہ
اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو
اے تماشا گاہِ عالم روے تو
ہمچو موج آتشِ تہ پا میروی
تو کجا بہرِ تماشا می روی
اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ
اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ
رمزِ سوز آموز از پروانہ
در شرر تعمیر کن کاشانہ

یہ مثنوی بھی ڈاکٹر اقبال کی دوسری نظموں کی طرح تعقید لفظی اور معنوی سے بری نہیں ہے۔[۸] تاہم بعض مقامات پر مسلسل اشعار اس قدر روان اور سلیس البیانی کے ساتھ مؤثر ہیں کہ بار باران اشعار کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔خوف ویاس کی بُرائی میں لکھتے ہیں:

از دمش میرد قوائے زندگی
خشک گردد چشمہ ہائے زندگی
خفتہ باغم در تہِ یک چادر است
غم رگِ جاں را مثالِ نشتر است
ایک در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیمِ لا تحزن بگیر
ایں سبق، صدیق را صدیق کرد
سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد
گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو
دشمنت ترساں اگر بیند ترا
از خیابانت چو گل[۹] چیند ترا
ضربِ تیغِ او قوی تر می فتد
ہم نگاہش مثلِ خنجر می فتد
بیم چوں بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما
ہر شر پنہاں کہ اندر قلبِ تست
اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زور و ریا پیراہنش
فتنہ را آغوشِ مادر دامنش
ہر کہ رمز مصطفیٰ[ؐ] فہمیدہ است

شرک او را در خوف مضمر دیده است

اتباعِ شریعت کے باب میں لکھا:

اے کہ باشی حکمتِ دیں را امین
با تو گویم نکتۂ شرعِ مبین
چوں کسے گردد مزاحم بے سبب
بسا مسلماں در ادائے مستحب
مستحب را فرض گردانیده اند
زندگی را عینِ قدرت دیده اند
روزِ ہیجا لشکرِ اعدا اگر
از خیالِ صلح گردد بے خطر
گیرد آساں روزگارِ خویش را
بشکند حصن و حصارِ خویش را
سرِ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست
زیستن اندر خطرھا زندگی ست
شرع می خواھد کہ چوں آئی بجنگ
شعلہ گردی، واشگافی کامِ سنگ
آزماید قوتِ بازوئے تو
می نہد الوند پیشِ روئے تو
باز گوید سرمہ ساز الوند را
از تفِ خنجر گداز الوند را
نیست میشِ ناتوانے لاغرے
درخورِ سر پنجۂ شیرِ نرے
باز چوں با صعوہ خوگر می شود
از شکارِ خود زبوں تر می شود
خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثلِ کوہسارت می کند

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی، آسماں سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دلِ آہن رباید زنگ را

اسی طرح تمام بیان مسلسل، بلند تر اور پُر اثر ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے عالمگیر اور اکبر کی نسبت اپنا جو خیال ضمناً ظاہر کیا ہے، اب اکثر اربابِ فکر اسی نتیجے پر پہنچے ہیں:

شاہ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبارِ دودمانِ گورگاں
پایۂ اسلامیاں برتر ازو
احترامِ شرعِ پیغمبرؐ ازو
درمیانِ کار زار کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا دمید
شمعِ دل در سینہ ھا روشن نبود
ملتِ ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ھند عالمگیر را
آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را
برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت
شمعِ دیں در محفل ما بر فروخت
کور ذوقاں داستاں ھا ساختند
وسعتِ ادراکِ او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود

چوں براہیمؑ اندریں بتخانہ بود

اسی طرح مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق، فلسفیانہ تشریح کے ساتھ، صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں۔

ایک بالغ نظر شخص اس مثنوی میں الفاظ کے صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال کی صحت میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کرسکتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ یہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے اس تقریظ میں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی، اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہیے اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبال نے جو اسرار و نکات اس میں حل کیے ہیں، اُن کی بنا پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فنِ قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید علمِ کلام کی ایک بہترین کتاب ہے۔ توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب اور قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پُر اثر اور تشفی بخش دلائل اس کے اندر موجود ہیں۔

(معارف، اپریل ۱۹۱۸ء)

حوالہ جات وحواشی

۱- مخزن (لاہور) کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء کو شائع ہوا۔
۲- یہ رائے دورِ آغاز کے کلام کے بارے میں ہے۔
۳- سیّد صاحب کے ایک دوستی قاضی عبدالوحید صاحب نے اُن کے خیال کو اس شعر میں بیان کیا ہے:

کیا چیز ہے شعر؟ سن لو گفتار ہے وہ
(قول)
کیا اصل ہے فلسفے کی؟ پندار ہے وہ
(علم)
مذہب کسے کہتے ہیں؟ تصوف کیا ہے؟
کردار اگر ہے یہ ، تو رفتار ہے وہ
(فعل قلب)   (فعل جوارح)

۴- غزنی کے مشہور شاعر (روم ۱۱۳۱ء)۔ متعدد مثنویاں اُن سے یادگار ہیں جن میں ''حدیقہ'' سب سے زیادہ مشہور ہے۔
۵- رموزِ بیخودی کی زبان کے لیے مکاتیب ملاحظہ ہوں۔
۶- زمر: ۵۳ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)۔
۷- عنکبوت: ۳۳ (نہ خوف کھا اور نہ ملال کر)۔
۸- ملاحظہ ہو 'مکاتیب اقبال بنام سید صاحب'۔
۹- اس تشبیہ میں کم از کم مجھ کو کلام ہے (س)۔
۱۰- شاید یہ فارسی محاورہ ہو۔ (س)

مثنوی رموزِ بیخودی — تنقیدی نظر[1]

سر عبدالقادر

مثنوی رموزِ بیخودی یعنی ''اسرار حیات ملیہ اسلامیہ'' حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کے اہتمام سے یونین سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوئی۔ ابتدا میں علامہ سر محمد اقبال کا دو صفحات پر مشتمل دیباچہ ہے اور چھوٹے سائز کے ۱۳۹ صفحات پر مشتمل متن۔ یہ کتاب پہلی بار چودہ سو کی تعداد میں چھپی۔ اس کا پہلا ایڈیشن پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

مثنویاں تو بہت لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی لیکن یہ امتیاز شاید کسی کو حاصل ہو کہ ملک و قوم تک کوئی ضروری پیغام پہنچانے کے لیے مثنوی کو ذریعہ اظہار خیال بنایا جائے۔ خدا جزائے خیر دے شیخ محمد اقبال کو جنھوں نے اس زمانہ انحطاط میں ملت اسلامیہ کو مثنوی اسرارِ خودی کے ذریعے سے پیغام عمل دیا ہے اور ''رمز بےخودی'' میں مژدۂ حیات سنایا ہے۔

دنیا میں سب سے بڑی مثنوی غالباً مولانا روم (علیہ الرحمۃ) کی ہے جس کو اسلامی ممالک میں اکثر لوگ قرآن مجید کے بعد اعلیٰ درجے کی مذہبی کتاب سمجھتے ہیں اور ''قرآن در زبان پہلوی'' کا خطاب دیتے ہیں۔ اس کی زبان ایسی سلیس اور انداز بیان ایسا دل نشین ہے کہ خاص و عام میں مقبول ہے۔ یہ عالی شان مثنوی ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ اس کی کئی ضخیم جلدیں ہیں جن میں کلامِ الٰہی کے ضروری مسئلے جا بجا عام فہم پیرایے میں اور مثالوں اور حکایتوں کے ذریعے لوگوں کو سمجھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد مذہب اسلام کی خدمت ہے۔ تصوف کا عنصر اس میں غالب ہے اور اس لیے یہ کتاب علما اور صوفیا دونوں میں مقبول ہے اور فلسفی بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں طرزِ مثنوی مولوی معنوں کا تتبع کیا گیا ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ان دو مختصر مثنویوں کا مولانا روم کی عظیم الشان کتاب سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ نسبت ضرور ہے کہ اقبال نے مثنوی شریف کی شیریں زبان اپنی مثنویوں کے لیے اختیار کی ہے

اور مثنوی کی مقبول بحر تبرکاً اپنے لیے انتخاب کی ہے۔ جناب مولانا علیہ الرحمۃ کا فیض معنوی سمجھیے کہ ان دونوں مثنویوں میں ایک خاص تاثیر موجود ہے۔ ذیل کے اشعار میں اسرارِ خودی کی تمہید میں اقبال نے خود اس فیض کا اعتراف کیا ہے:

ایں قدر نظارہ ام بے تاب شد
بال و پر شکست و آخر خواب شد
روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کہ بحرف پہلوی قرآں نوشت
گفت: ''اے دیوانہ ارباب عشق
جرعہ گیر از شراب ناب عشق
بر جگر ہنگامہ محشر بزن
شیشہ بر سر، دیدہ بر نشتر بزن
آشنائے لذت گفتار شو
اے درائے کارواں بیدار شو

''درائے کارواں'' یعنی اقبال نے بیدار ہو کر اس ارشاد کی تعمیل کی ہے۔ سوز و گداز خدا نے فطرت میں ودیعت کیا تھا، ملت اسلامیہ کی موجودہ حالت پر نظر پڑتے ہی وہ سوز و گداز نالہ نے کی طرح فریاد بن کر سینے سے نکلا اور پکارا کہ دنیا میں وہی افراد زندگی کا فرض کما حقہٗ ادا کرتے ہیں جو لذت عمل سے بہرہ یاب ہیں اور جو قوت عمل کھو بیٹھے یا محو خیال ہو بیٹھے ہوں ان کا شمار زندوں میں نہیں۔ اس ایک مضمون کو کئی پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے اور کئی تشبیہوں سے اور کئی مؤثر مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اسرارِ خودی کے لیے ایک بسیط ریویو جداگانہ درکار ہے جو پھر کبھی (اگر حالات مساعد ہوئے) لکھا جائے گا۔ اخبارات میں اس پر بہت لے دے ہو چکی ہے اور بہت کچھ اس کی تعریف میں لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت تو اس مثنوی کے دوسرے حصے سے بحث ہے جو حال میں شائع ہوا اور جس کا نام رموزِ بیخودی رکھا گیا ہے۔

اگر صرف دونوں مثنویوں کے ناموں کو سرسری طور پر دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ حضرت اقبال نے اضداد کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ نکتہ چینی زبان قلم سے بے اختیار نکلنے کو ہوتی ہے کہ پہلے تو ملت اسلامی کو پیغام دیا کہ اس کا ہر فرد خودداری سیکھے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے جد و جہد زیست کے میدان میں مردانہ کارزار کے لیے تیار ہو اور پھر دوسری کتاب میں خود ہی خودی سے بیگانہ بن کر وہی بے خودی کا جادۂ فرسودہ اختیار کر لیا۔ لیکن جب رموزِ بیخودی کو غور سے پڑھیں تو یہ اعتراض رفع ہو جاتا

ہے۔ اوّل تو یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے رموزِ بیخودی میں ان اُصول سے بالکل انحراف نہیں کیا جو اسرارِ خودی میں اُصول زندگی قرار دیے گئے تھے اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں افراد کے لیے خودی اور خودداری ذریعہ استواری ہے، وہی افراد کا اپنی ہستی، ہستی قومی میں محد کر دینا اور اپنی انفرادی زندگی کے جز کو قومی زندگی کی کل میں شامل کر دینا قومی ترقی کے لیے لازم ہے اور اس کو بے خودی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا یہ وہ بے خودی ہے جو خودداری اور خود شناسی کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جو فرد و قوم دونوں کے لیے عین نفع ہے۔ اس مثنوی میں یہ مضمون کس خوبی سے ادا ہوتا ہے:

تو خودی از بے خودی نشاختی
خویش را اندر گماں انداختی
جوہر نوریست اندر خاک تو
یک شعاعش جلوۂ ادراک تو
خوگر پیکار پیہم دیدمش
ہم خودی ہم زندگی نامیدمش
چوں ز خلوت خویش را بیروں کشد[۲]
پائے در ہنگامہ جلوت نہد

ـــــــ

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گل برگ چمن گردد خودی

یہ اُصول ذہن نشین کرتے ہوئے شاعر مطلب کی طرف آتا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ ربط افراد افراد کا نام ہی ملت ہے اور افراد کی ہستی کے قیام کا مدار اسی ارتباط پر ہے اور اس دعوے کی زبردست دلیل نیچر کا مشاہدہ ہے:

مدعائے ما، مآل ما یکسیت
طرز و انداز خیال ما یکسیت
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

قومی زندگی کی بنیاد یک دلی پر رکھ کر قومی خیالات کی تدبیروں کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔ پہلے تنبیہ کی ہے کہ یاس و نا اُمیدی، قومی زندگی کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہیں۔ ترقی چاہنے والی قوموں کو چاہیے کہ نا

اُمیدی کو پاس نہ آنے دیں، حوصلے بلند رکھیں اور سرگرم جستجو رہیں۔ نا اُمیدی عموماً خوف سے پیدا ہوتی ہے یا غم سے اس لیے خوف اور غم سے بھی الگ رہنا چاہیے۔ اس ہدایت پر عمل کی تاکید کرتے ہوئے مثنوی میں آیات و احکام قرآنی کے حوالے پیش کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے ڈرنا شان ایمان کے خلاف ہے، اور جب بیم غیر اللہ سے نجات ہو تو کوئی کام ایسے آدمی کے لیے دشوار نہیں ہوتا:

بیم چوں بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما

اس سلسلے میں ایک حکایت اورنگ زیب عالم گیر کی درج کی ہے جس پر جنگ میں نماز پڑھنے کی حالت میں شیر نے حملہ کیا مگر بادشاہ اس سے نہ ڈرا اور بغیر تاک کر ضرب لگانے کے اس نے خنجر کا ایسا وار کیا کہ شیر ہلاک کر دیا اور پھر مصروف نماز ہو گیا۔ اس حکایت کو نظم کرتے ہوئے اورنگزیب کی خدمات مذہبی کی تعریف کی ہے اور اس ساری تعریف کی جان یہ شعر ہے جو عالم گیر کی شان میں کہا گیا ہے۔ دوسرے مصرعے کی بلاغت خصوصاً قابلِ داد ہے:

درمیان کار زار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں

اس کے ملت اسلامی کو بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا باہمی رشتہ جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات بابرکت کی بدولت مضبوط ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما
کثرت ہم مدعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملت شود

پھر ملت اسلامیہ کی خصوصیات چند پرمعنی شعروں میں بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ حریت اور مساوات اس ملت کی سرشت میں داخل ہے۔ اسلامی مساوات کی تمثیل کے طور پر ایک دردانگیز تاریخی روایت نظم کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ سلطان مراد نے ایک مسجد بنوائی تھی جو ملک خجند کے رہنے والے ایک پردیسی معمار نے بنائی تھی۔ بادشاہ کو اس کی عمارت کچھ ناپسند ہوئی اور اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس معمار نے قاضی کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف استغاثہ کیا۔ بادشاہ عدالت میں طلب کیا گیا۔ قاضی نے مقدمہ سننے کے بعد فتویٰ دیا کہ:

عبد مسلم کم تر از احرار نیست

خون شہ رنگیں تر از معمار نیست

یہ فتویٰ سن کر بادشاہ نے اپنا ہاتھ کاٹے جانے کے لیے پیش کیا:

چوں مراد ایں آیہ محکم شنید
دست خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند[۳]
آیہ بالعدل و الاحسان خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش
از برائے مصطفیؐ بخشیدمش

یعنی قانون نے ہاتھ کاٹنے کے عوض میں ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ دے دیا مگر خود مستغیث کو رحم آ گیا اور اس نے بدلہ نہیں لیا اور بادشاہ کو معاف کر دیا۔ آ گے چل کر میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے متعلق ایک پر درد باب لکھا ہے جس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت حریت کی بنیاد رکھنے کے لیے اور ضمیر انسانی کا حق آزادی قائم کرنے کے لیے تھی:

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

اقبال نے ایک باب ہجرت پر لکھا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس میں معنی آفرینی کی داد دی ہے۔ مقصود تو اس باب سے وہی ہے جو پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ ملت اسلام کی بنیاد مذہبی یگانگت پر ہے اور یہ کسی خاص ملک یا وطن کی پابند نہیں، مگر اس باب میں مصنف نے اپنے دعوے پر ایک زبردست دلیل ہجرت نبوی کے مسلمہ واقعے سے پیدا کی ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ جو مکہ شریف سے ہجرت کر کے مدینہ منور میں جا بسے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ فی الحقیقت دشمنوں سے عاجز آ کر بھاگ گئے تھے، بلکہ اس میں یہی حکمت چھپی تھی کہ اسلام کی عالم گیری کی بنیاد پڑے اور اسلام کے نام لیوا ہر جگہ اپنا وطن بنائیں اور وہاں نور اسلام پھیلائیں:

آں کہ در قرآن خدا او را ستود[۴]
آں کہ حفظ جان او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش

لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است
این ز اسباب ثبات مسلم است

اس کے مقابل میں ملت کی بنا وطن پر رکھنے کا جو خیال ہے اور جس کے خلاف دلائل چند اشعار میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ ان پر اس باب میں اقبال نے ایک اور دلیل اضافہ کی ہے اور وہ تمام انسانی اغراض کے لحاظ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف جغرافی قطعات میں سے ایک قطعہ بنائے ملت قرار پانے سے دنیا میں تنگ خیالی ایسی پھیلی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی ہے اور دنیا میں جنگ و جدال کی کثرت ہو گئی ہے۔ گہری فلسفیانہ نگاہ سے اگر دیکھیں تو عام بنی نوع انسان کو اس اُصول سے ضرور نقصان پہنچتا ہے، گو وہ محدود جماعتیں جو علیحدہ علیحدہ قومیں بنی ہوئی ہیں، اس اُصول کی بدولت جلد ترقی کر جائیں۔ ان خیالات کو نظم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
این شجر جنت ز عالم بردہ است
تلخی پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام[۵] ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

اس مسئلے سے کہ ملت اسلامی حدود مکانی کی پابند نہیں، قدرتی طور پر حدود زمانی کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے اور اس کے متعلق شاعر نے ایک باب میں یہ بیان کیا ہے کہ ملت اسلامی کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

رومیاں را گرم بازاری نماند

آں جہاں گیری جہاں داری نماند
شیشہ ساسانیاں در خوں نشست
رونق خمخانہ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بودست و ہست
گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

اسلامیوں کو یہ بتانے کے بعد کہ ان کی ملت ان کے مذہب پر مبنی ہے اور اس کے دوام کا وعدہ ہو چکا ہے، ان کو یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ سب جبھی ہوگا کہ وہ اپنے آئین کے پابند ہوں جو ان کی آسمانی کتاب یعنی قرآن شریف میں مندرج ہے۔ اس باب میں قران شریف کی تعریف خوب اشعار میں کی گئی ہے جن میں سے صرف دو یہاں درج کیے جاتے ہیں:

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمین

آگے چل کر مسلمانوں کو شرع کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے:

ہست دین مصطفیٰؐ دین حیات
شرع او تفسیر آئین حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا
آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

اگر اس طرح باقی سب بابوں کا خلاصہ اس مختصر تبصرے میں درج کیا جائے تو شاید باعث طوالت ہوگا۔ شایقین اصل کتاب کو پڑھیں اور مستفید ہوں، مگر وہ تین بابوں کے خاص خاص اشعار کا ذکر کیے بغیر پھر بھی رہا نہیں جا سکتا۔ ان میں ایک تو وہ باب ہے جس میں علم تاریخ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ ترقی قومی کے لیے تاریخ دانی لازم ہے۔ یہ مضمون کیسے خوب صورت سلیس لفظوں میں ادا ہوا ہے:

ربط ایام است ما را پیرہن
سوزنش حفظ روایات کہن

چیست تاریخ اے ز خود بیگانۂ
داستانے، قصۂ افسانۂ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مرد رہ کند

اس سے اگلا باب بھی توجہ کے قابل ہے۔ اس میں عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ جتایا گیا ہے کہ اچھے بیٹوں، بیٹیوں کی ماں بننا بڑے فخر کی بات ہے اور نوع انسان کے صنف نازک کا یہ سب سے بڑا فرض ہے۔ جدید زمانے میں اس فرض کی طرف جو بے توجہی کا میلان ہے وہ بہت نقصان دہ ہے۔ ایک گنوار اور بدوضع لڑکی، جو کسی نیک اور کارآمد شخص کی ماں بنتی ہے، اس نازنین گل اندام سے بہتر ہے جو اپنے اس اہم فرض سے بے پروا ہو یا اس ذمے داری کی متحمل ہونے کے نا قابل۔ اس پیغام کو تو حضرت اقبال سے انھی کے الفاظ میں سنیے:

آں دخے[6] رستاق[7] زادے جاہلے
پست بالائے، سطبرے[8] بد گلے[9]
نا تراشے، پرورش نادادۂ
کم نگاہے، کم زبانے، شادۂ
دل ز آلام اموت[10] کردہ خوں
گرد چشمش حلقہ ہائے نیل گوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست
یک مسلمان غیور و حق پرست
ہستی ما محکم از آلام اوست
صبح ما عالم فروز از شام اوست

رسول عربیؐ کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا نام مبارک اس سلسلے میں مسلمان عورتوں کے لیے نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی خوبیوں اور نیکی کے لحاظ سے رسول کریمؐ جیسے باپ کی پیاری بیٹی، حضرت علیؓ جیسے شوہر کی چہیتی بیوی اور حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ جیسے بیٹوں کی واجب التعظیم ماں بنیں اور اُنھوں نے اپنی زندگی میں مثال قائم کی کہ عورت ذات کس طرح اپنی زندگی کے ان تینوں مرحلوں پر اپنے فرائض کو ادا کرے کہ ساری ملت کے لیے بہتری کا باعث ہو۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شان میں جو اشعار اقبال کے قلم سے نکلے ہیں وہ اس دلی ارادت کے ترجمان ہیں جو اقبال کو رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے ہے اور

ان میں یہ دو شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ صفات کا ایک دریا ہے جو ایک ایک شعر کے کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ اہلِ نظر داد دیں گے اور جنھیں نہ معلوم ہو وہ صفحات تاریخ و سیر ملاحظہ کریں:

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامان نماز

آخری باب، جس میں مثنوی کے مطالب کا خلاصہ اور سورۂ "قل ھو اللّٰہ احد" کی تفسیر ہے، خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب کا خاتمہ عرض حال مصنف پر ہوتا ہے جو بارگاہِ رسالت مآبؐ میں کی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی موجودہ حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ راستے سے دور جا پڑے ہیں۔ ان کے ''شیخ''، ''برہمن'' سے زیادہ بت پرست ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے دماغوں میں بت چھوڑ مندر بھر گئے ہیں۔ جو صفات پہلے غیر مسلموں سے مخصوص تھیں وہ اُنھوں نے سیکھ لی ہیں۔ موت سے نہ ڈرنے کی بجائے ڈرنے لگے ہیں۔ عرب کی بجائے عجم کی تقلید میں مبتلا ہیں۔ دعا ہے کہ ان کو جو پیغام اس مثنوی کے ذریعے رہ حق کی طرف پھر آنے کے لیے دیا گیا ہے وہ با اثر ثابت ہو اور مقبول ہو۔

اخیر میں چند شعر شاعر نے اپنی ایک دلی آرزو کے اظہار میں لکھے ہیں اور ان میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان شعروں کا مزا اہلِ دل اور فدائیان نبیؐ لیں گے:

ہست شان رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
مسلمے از ماسوا بیگانۂ
تا کجا زنجیریٔ بت خانۂ
حیف چوں او را سرآید روزگار
پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم خوشا فردائے من

(ماہنامہ مخزن لاہور بابت ستمبر ۱۹۱۸ء)

مثنویات اقبال
(اسرار و رموز)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری
مالک رام

مترجم کا نوٹ: جن لوگوں نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا دیباچہ دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ) جو علیحدہ کتابی صورت میں بھی بعنوان محاسن کلام غالب چھپ چکا ہے، پڑھا ہے، وہ اس سے موصوف کے عمق فکر اور پہنچائی خیال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے، جن سے علم وادب اُردو کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ بدقسمتی سے اجل نے انہیں فرصت نہ دی کہ وہ کچھ مستقل خدمت زبان کر سکتے۔ اُنھوں نے سوائے چند مضامین کے کوئی اپنی زیادہ پائیدار یادگار نہیں چھوڑی، مگر جو تھوڑا بہت بھی ان کے قلم سے نکلا ہے، کافی ہے ہم اس سے اُن کے وسعت مطالعہ، وقت نظر اور اصابت رائے کی نسبت ایک صحیح رائے قائم کر سکیں۔

ایک برخود غلط ادیب کی رائے میں دیباچہ مذکور میں ''سوائے شرح اشعار کے اور جو کچھ ہے، سب واہی تباہی ہے۔'' یہ رائے اُردو کے ایک شاہکار مضمون کی نسبت ہے اور ہر شخص کا حق ہے کہ وہ کسی چیز کی نسبت جو رائے چاہے قائم کرے۔ مگر کیا اچھا ہو کہ تنقید اور رائے قائم کرنے سے پہلے جذبہ تنقیص و تفضیح دل سے نکال دیا جائے۔ پندار اور تفاخر کوئی اچھی چیز نہیں، اور جب کسی نقاد کے دل میں یہ چیزیں راہ پکڑ لیں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اور رواروی میں ایسے خیالات کا اظہار کر جاتا ہے جو کسی دوسری حالت میں غالباً وہ زبان پر نہ لائے گا۔

اگر ادیب ممدوح نے ذرا یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی کہ مضمون لکھتے وقت ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی، تو شاید وہ اس فیصلے پر نہ پہنچتے۔ میرے نزدیک اس مضمون میں جو والہانہ جوش دکھایا گیا ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل، غالب سے پہلے اُردو زبان کا جو سرمایہ تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ ایسا پامال اور فرسودہ مضمون ہو چکا ہے کہ اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ غالب وہ پہلا شخص ہے جس نے ہمیں بتایا کہ

اُردو زبان میں ترقی کی کتنی صلاحیت ہے، اس میں وسعت کی کتنی گنجائش ہے، اور اس میں کیسے کیسے خیالات جدید اور مضامین عالیہ کا اظہار ممکن ہے۔ بجنوری مرحوم کے پیش نظر غالب بھی تھا اور اس کے پیشرو معاصرین بھی۔ انھیں حیرت ہوئی کہ اس آذر کدے میں یہ ابراہیم کیونکر ہوا؟ جواب ایک ہی تھا۔ جو ہر صالح اور ذہانت خدا داد۔ اس امر نے ان کے دل پر غالب کے تفوق کو منقوش کر دیا اور اس کے ساتھ ہی قدرتی طور پر خوش اعتقادی کا شائبہ بھی پیدا ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مضمون میں مرحوم نے آئینۂ غالب میں میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اپنا تخیل اتنا بلند اور علم اتنا وسیع تھا کہ لکھ تو وہ رہے تھے دیوان غالب پر تبصرہ لیکن جا بجا اپنی رُوح اور دماغ کے نقوش کی تعبیر دیوان غالب سے ڈھونڈ رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے مرغوبات کو غالب پر چسپاں کر دیا۔ لازماً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون زیر بحث میں ایسے مبحث بھی آ گئے ہیں، جو نفس مضمون سے بے تعلق سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ واہی تباہی ہے۔ یقیناً اس میں بھی اتنا سامان بصیرت موجود ہے، کہ ہم اس سے غالب کی دھندلی تصویروں کو زیادہ اُجاگر کر سکتے ہیں اور غیر مما لک کے مصنفین کے ساتھ موازنہ کر کے ایک رائے (خواہ وہ کتنی ہی غیر مکمل کیوں نہ ہو) قائم کر سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون بھی ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اسرارِ خودی سب سے اوّل بار ۱۹۱۶ء میں اور رموزِ بےخودی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ مرحوم نے جب ہی یہ مضمون انگریزی رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ میں لکھا تھا۔ جب ایک ہی زبان کے خیالات دوسری زبان میں منتقل کیے جائیں تو وہ اپنی شگفتگی اور چستی کا اکثر حصہ کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے، میں نے لفظی ترجمہ سے احتراز کیا ہے مگر کہیں بھی اصل مضمون کی رُوح کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ نوٹ سارے کے سارے میں نے خود بڑھائے ہیں، اور کوشش کی ہے کہ متعلقہ اشعار درج کر دیے جائیں۔ لیکن پھر بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مضمون پر کے تمام اشعار دے دیئے گئے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ایک موضوع پر طرح طرح سے بحث کی گئی ہے۔ جگہ جگہ نئے نئے انداز سے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر تمام متعلقہ اشعار درج کرتا تو بلا مبالغہ دونوں مثنویاں ساتھ چھپ جاتیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ناظرین اسرار و رموز کا خود غائر مطالعہ کریں اور اُن کے مضامین کو سمجھنے کی سعی کریں۔ فقط، مالک رام

جب نقد و تبصرہ کا موضوع کوئی زندہ مصنف ہو تو نقاد کے لیے لازم ہے کہ قدم پھونک پھونک کر اُٹھایے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ مصنف اور نقاد کے درمیان کوئی رنگین پردہ حائل ہو جائے گا، یا قرب مکانی ہی

مصنف کے خط و خال کی تفاصیل کو دھندلا کر دے۔

ہندوستان کے اسلامی ادب میں رُوح ملائے اعلیٰ کی جانب صعود میرزا غالب کے زمانہ سے بدستور جاری ہے۔ غالب، حالی اور اقبال ایک مقدس اقالیم ثلاثہ کے ارکان ہیں۔ غالب نے اس سکون و جمود کا خاتمہ کر دیا ہے، جو انحطاط کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دیئے۔ مگر وہ کوئی غیر معقول مشکک نہیں تھا، جسے اپنے شک کی صحت پر بھی یقین نہ ہو۔ اس کا شک ایک چنگاری تھی، جس نے دُنیا میں آگ سی لگا دیں۔ دہلی کی سلطنت اس کی شاعری کی متحمل نہ ہوسکی اور اس کی ایک نگاہ نے اسے ملیا میٹ کر دیا۔

حالی نے جس کے خون میں شعرائے عرب کی سی گرمی تھی، دیکھا کہ دُنیا اپنے ظاہری حسن و نمائش کے باوجود تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اس نظارہ نے اسے بہت متاثر کیا، مگر اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی۔ اس نے غم و یاس کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت کی مسرت کا احساس کیا اور اپنے اُستاد کی تاخت کردہ عمارت کے کھنڈرات پر ایک نئی دُنیا کی تعمیر ٹھانی، اور اسے اپنے سینہ میں نشو و نما دی۔ اُمید کی جھلک نے اسے نئی زندگی دی اور یوں تن مردہ میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔

اقبال کی شاعری اب یاس و قنوط کی زنجیروں سے آزاد ہوگئی ہے۔ اس نے اُس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے، اور نئی عمارت کو متفاوٗلی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ اس کا نام وعدہ و بشارت کا مترادف ہے۔ اس نے زمانہ حاضرہ کے غیر ملکی اثر پر قابو پا لیا ہے، جو فضائے ہند پر چھایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے اس اخلاقی قوت کی مدد سے کیا ہے، جس کا منبع اور مبداء خالص اسلامی ہے۔ اس کی رُوحانی تعلیم نے اس انانیت کو فتح کر لیا ہے، جو اس مادّی دور کی پیداوار ہے۔ اقبال اسلامی کارواں کا سالار ہے جس کی منزل مقصود حرم محترم ہے۔

اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اور خود ہی جوان ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اس کی دونوں مثنویوں (اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی) سے پوری طرح نمایاں ہے۔ ان میں وہ زندگی ہے، وہ طاقت ہے جس کے لیے ہماری نئی نسل پُرانے غزل گو شعراء کے دواوین کو بے سود کھنگالتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا ہے، جس نے مردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے ہیں۔ زمانہ پر اس کے پیغام کی اہمیت رفتہ رفتہ واضح ہوگی، جو زمانہ حاضرہ کی ان دونوں معرکہ آراء نظموں میں پنہاں ہے۔

مثنویاں ایک ایسے غیر فانی کام کا جزو ہیں، جو تکمیل کے بعد اسلامی دُنیا کے خواب کی صحیح تعبیر ہوگا۔ اقبال نے نظریہ کے مطابق موجودہ اسلامی ممالک کے تنزل کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے عمل کی زندگی

کی بجائے افلاطونی بے عملی کو اختیار کر لیا ہے۔ افلاطونیت جدیدہ اور حافظ نے ان سے وہ احساس مسرت چھین لیا ہے، جو ''کچھ کر لو'' کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اور اس کی جگہ اس دماغی تفتیش نے لے لی ہے، جو ایک تن بیمار کا خاصہ ہے۔ مسلمانوں میں سنگ خارا کی سختی کی بجائے کوئلہ کی سی نرمی آ گئی ہے۔ خوف خدا کی جگہ مخلوق خدا کا خوف ان پر حاوی ہو گیا ہے۔[1]

مگر زندگی کا ایک نصب العین بنانے سے سب خوف دور ہو جاتے ہیں۔ ترقی و عروج اسلام کے لیے خدا نے ودیعت کر رکھے ہیں۔ پس توحید الٰہی پر کامل اعتقاد ہمیشہ خوف کو زائل کرتا ہے[2] اور دل میں وہ عزم صمیم پیدا کرتا ہے، جو اخلاق کا طغریٰ ہے۔ حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیر[3] اندرو قلس اور شیر کی کہانی[4] نہیں ہے۔

اسلام کی رُوح مساوات کی رُوح نہیں ہے۔ بانیان سلطنت کا خون بانیان مکانات آب و گل سے زیادہ قیمتی نہیں۔ شریعت کے معتوب کے لیے کوئی پناہ نہیں اور جس کا محافظ قرآن کریم ہے، اسے خوف سے کوئی واسطہ نہیں۔[5]

اقبال ایک محدود زمانہ کے اندر اسلامی نظام کو از سر نو حیات تازہ اور شباب بخشنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بعینہ جس طرح ایک مہوس مادۂ خام سے سونا نکال لیتا ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کا ہے مگر اس کی نظر مستقبل پر بھی ہے اور موجودہ زمانہ کا نکتہ چیں بھی ہے۔

ایمرسن[6] افلاطون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہملٹ بالکل افلاطونی ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو افلاطون کے ہملٹ پن (تشائم پسندی) کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ اس تشائم پسندی اور اخلاقی ضعف نے کئی قوموں کو بلندی سے دے پٹکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس زمین پر رہیں اور یہاں کے ''سرکار'' کی نکوکاری پر توجہ دیں۔ افلاطون اس پرندۂ صبح کی مانند ہے، جو ایک اثیری دنیائے خواب و خیال میں پرواز پر قانع ہے۔ برخلاف اس کے اقبال ایک بحری عقاب کی طرح ہے، جو بحر حیات کی طوفان خیز موجوں پر سوار ہو۔ اقبال کا فلسفہ خودی اور عمل کا فلسفہ ہے۔

اقبال کو سب سے بڑا اعتراض اس یونانی فلسفی کے مسئلہ عیان[7] پر ہے، جسے جدید افلاطونیوں نے مرتب کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ افلاطونیت جدیدہ پر بدترین ضعف طاری ہے اور وہ ضعف فقدان جذبہ عمل سے ہے۔ ان کا مابعد الطبیعیات قاطع حیات ہے اور مقصد زندگی کا محو کنندہ۔ کیا یہ تباہی کا راستہ نہیں؟ اقبال کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہے۔ اسلامی زندگی سے بڑھ کر اور کوئی معراج نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تحقیق میں زمین پر ایک نائب قائم کرنے والا ہوں۔[7]

اقبال میں جان ہے، چستی ہے، خلاق ہے، قناعت ہے، تفاؤل ہے، خون تازہ ہے، حقیقت پژوہی

ہے، اور سب سے بڑھ کر اسلام ہے۔ وہ نہیں دیکھ سکتا کہ ملت ابراہیمی دار الفنا میں داخل ہو، خواہ اس کا راستہ دکھلانے والا خود افلاطون اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کی فتادگی اور گوسفندی اسے غضبناک کر دیتی ہے۔ وہ اسے رُوحانیت اور تصوف جدید پر محمول کرتا ہے۔ یہاں وہ ایک مبارز کی حیثیت سے کھڑا ہو جاتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مد مقابل کون ہے۔ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں، وہ حافظ شیراز ہے۔ اقبال کا علم تلوار سے کم کاٹ نہیں کرتا۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ یہ رُوحانیت یا تصوف بعد کی پیداوار ہے، اور ہمارے مذہب کی رُوح کے منافی ہے۔ اسلام کا اساسی اُصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد ''ہمہ اوست'' پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور ''ہمہ اوست'' منفی۔ ہارن کا خیال ہے کہ تصوف جدید بہت حد تک زرتشتی اور بدھ مت کے خیالات سے متاثر ہے۔ فان کریمر اس میں ویدانت کے آثار دیکھتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں صداقت افلاطونیت جدیدہ اور آزادنشو وارتقا کے بین بین ہے۔

تصوف کے رؤیت حق اور افلاطون کے اعیان نامشہود میں مماثلت ہے۔ صوفیوں کا رقص مستانہ در حقیقت نقل ہے۔ فلاطونی رُوح کی جو ایک متحرک دائرہ ہے، اپنے مرکز قدیم کے گرد اور بس۔ اور یہ مرکز خود خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ افلاطونیت جدید اور تصوف جدیدہ دونوں کی تفاصیل اور ظواہر میں بہت حد تک تطابق موجود ہے۔ براؤن لکھتا ہے کہ فلاطینوس[۸] کی تحریرات صاحب الفہرست[۹] اور شہرستانی[۱۰] سے مخفی نہیں تھیں۔

اسلام ان تمام بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ خدا ربّ العالمین ہے اور مادّہ کی علت سے مبرا۔ اس کی مخلوق سراب نہیں۔ جس طرح خدا لکڑی اور پتھر سے تراشا نہیں جا سکتا، اسی طرح اس کی رویئت بھی مادّی یا رُوحانی آنکھوں سے ناممکن ہے۔ شیخ احمد سرہندی[۱۱] اپنے ملفوظات میں تحریر فرماتے ہیں: ''اگر کوئی صوفی یا مجذوب خیال کرتا ہے کہ اس نے خدا کا دیدار کیا ہے، چشم ظاہر سے یا چشم باطن سے، تو اس نے اپنے واہمہ یا دماغ کی متصور شکل کے سوا کچھ نہیں دیکھا'' خداوند تعالیٰ بے مثال ہے، یکتا ہے اور نظر سے اوجھل۔ خدا تک پہنچے کا راستہ شریعت کا راستہ[۱۲] جدید تصوف کے خیالات باطلہ ''مغضوب'' اور ''ضالین'' کے راستہ پر چلاتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اسلامی عقائد و شعائر کو افلاطون اور ارسطو کے تاثرات سے آزاد کر دے۔ تاثرات جن کا لازمی نتیجہ رہبانیت و تباہی ہے۔ تصوف جدید رہبانیت ہے۔ یہ اس دُنیا کو خواب درخواب مایا یقین کرتا ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے سے کتراتا ہے۔ اس نے اسلام کی تعلیم عمل کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور عمل ہی اصل اسلام[۱۳] ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو بھی اسی عمل کی طرف واپس بلاتا ہے۔ اس کی حقیقی رُوحانی تعلیم، اخلاقی قوت، جوش، فکر، سرگرمی اور عمل میں مضمر ہے۔ مگر وہ حافظ سے کیوں برسرکار پیکار ہے؟ اور مولانا جلال الدین رومی کے خلاف صف آرا نہیں ہوتا،

حالانکہ موخر الذکر تمام متصوفانہ شاعری کا باوا آدم ہے۔ سبب ظاہر ہے۔ صوفی جب اپنے تجربات بیان کرتے ہیں، تو انھیں قدرتاً الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں جو عوام کے فہم و ادراک کے مطابق ہوں۔ خیالات خواہ آسمانی ہی کیوں نہ ہوں، مگر اظہار خیالات زمینی الفاظ ہوں گے۔ عشق جب ''مے'' اور ''نغمہ'' کے پردوں میں بیان کیا جائے گا، تو عجب نہیں اس سے ماڈی اور ہیجانی لذات مراد لی جائیں۔ سنائی، عطار اور رومی باوجود اس کے ایسی زبان میں لکھتے ہیں، جو ان کی رُوح حقیقی کو صاف نمایاں کر دیتی ہے۔ وہ اپنے ناظرین کو دُنیا سے پرے لے جائیں۔ مگر وہ اُس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے۔ برخلاف اس کے حافظ نے ان کے نشہ آور جرعہ میں اصلی شراب ٹپکا دی ہے۔ اس کا دیوان بصیرت سے زیادہ سکر آور ہے بے ریب سقراط[14] کی مانند حافظ مخرب اخلاق نہیں، تاہم وہ ان کے خراب کرنے میں عمدہ معاون ضرور ہوا ہے۔ اس سے بہتوں نے شراب حقیقت کی بجائے شراب مجازی پی ہے۔ اقبال کا حملہ دراصل اس اپیکورس[15] کے خلاف ہے، نہ کہ شعراء کے ماڈی تصوف جدیدہ پر۔

جیسے کہ نکلسن دیوان شمس تبریز کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

تصوف جدید کے انحطاط کی انتہا ہے کہ اس نے پیر کو الوہیتی صفات سے متصف کر دیا ہے۔ پیر کے سب وشتم اور بد اخلاقیوں بلکہ اس کے جرائم کی نہ صرف یہ کہ تاویل کی جاتی ہے بلکہ اُن کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔۔۔ ایسے نظریوں کا جو براثر سادہ لوحوں پر پڑتا ہے، اس کے نتائج سے کون آگاہ نہیں۔'' یہ دوسری وجہ ہے اقبال اور آج کل کے صوفیوں کے درمیان جنگ کی۔ جب اسرارِ خودی شائع ہوئی، تو بعض صوفی پیر جنھیں روایات باطلہ کی پابندی، اور شریعت حقہ سے ناواقفیت کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا[16] اقبال کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ''اسے دار پر کھینچ دو، یہ مسلمانوں کو مغربی ماڈیت کی تعلیم دیتا ہے۔'' اقبال کی آواز شور و شغب سے بلند سنائی دی۔ ''جاہل اور برخود غلط! خدا کی شان کہ آج افلاطونی اور ہمہ اوستی مجھے مغربی ماڈیت کا شائع کرنے والا خیال کر رہے ہیں۔

آج ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے اہم ترین سوال مسئلہ وطنیت ہے۔ اسلام قید مکانی سے آزاد ہے اور وطنیت بستہ حدود و جہات ہے۔ اقبال بھی اپنے آپ کو اسلام اور وطن کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہے۔ اس کی شاعری ان خیالات کی تصویر ہے، جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں گزر رہی ہیں۔ وہ میکیاولی[17] کو مجرم گردانتا ہے، اور اسے ''مقامی ریاست'' کے خیال کا باقی قرار دیتا ہے۔ اقبال اس فلارنساوی کو مورد طعن ٹھہراتا ہے، جس نے دُنیا کی انکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کی ''کتاب الملوک'' شاہنشاہوں کا لائحہ عمل بنی بلکہ اس لیے کہ اس کی تعلیم دانتے[18] اور مارسلیس کے ''ریاست عالمگیر'' کے خیال کو زائل کرنے اور عیسائیت روما کو حدود اطالیہ میں قیام کرنے پر منتج ہوئی۔ اقبال نہیں چاہتا کہ اسلام ملکوں کی

چہار دیواری میں قید ہو کر لخت لخت ہو جائے۔ اقبال کی سیاست اخوت پر مبنی ہے، نہ کہ خودغرضی پر۔ مذہب سیاسی زندگی کا حقیقی پاسبان ہے۔ وطن یا ملک ایک عارضی یا جغرافیائی چیز ہے۔ تاریخی حوادث و واقعات اس کے حدود اور نصب العین کو متواتر بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی حیات عارضی ہوتی ہے۔ اور وہ چند صدیوں کے لیے بھی ایک نہج پر قائم نہیں رہتا۔ اقبال کی ''ریاست عالمگیر'' مذہبی ہے، خدائی ہے، آدرش ہے، اور ابدی ہے مگر بایں ہمہ اقبال یہ نہیں کہتا ہے حبّ وطن، حبّ الایمان کی نقیض ہے۔ کل مین جزو ہوتا ہے۔ عالمگیر اخوت میں حبّ وطن پوشیدہ ہے۔ اسلامیاب ہند کے رایت پر دو نشان ہیں، اسلامیت محض اور وطنیت اور دونوں زندگی کی ایک ہی منزل کی جانب راہنمائی کرتے ہیں، اگرچہ راہیں الگ الگ ہیں۔[19]

درحقیقت اقبال میں مذہب کے غائر مطالعہ اور عمیق جذبہ حب الوطنی کا امتزاج کامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کا سیاسی مطمح نگاہ اس کے بلند مذہبی نصب العین کے ماتحت ہے۔ سیاسی نقطہ خیال اور مذہبی مقصد نظر کے اختلاط نے اس کے سیاسی فلسفہ کو ایک نئی حیثیت دے دی ہے۔

فریڈرک نٹشے[20] کے خیال میں فن کی دو شکلیں ہیں: (۱) اپالونی اور (۲) ڈایونیسنی، اپالونی پر وقار اور سنجیدہ تفکر ہے۔ ڈایونیسنی طوفان اور ہیجان کا دوسرا نام ہے۔ نٹشے کا ''ارشادات زرتشت'' جو عہد حاضر کے جرمنی کا شاہکار ہے، بالحاظ ہر دو موضوع اور طرز تحریر ڈایونیسنی ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی بھی جو دونوں اسلام کی حیاۃ ثانیہ کے نشانات ہیں، اسی قبیل سے ہیں۔ کیا اقبال نٹشے کے زیر اثر ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے، اگرچہ وہ ہمیشہ مستعار چیزوں کو جلا دے کر ایک نئی اور عجوبہ چیز بنا دیتا ہے۔ نٹشے میں اس کے ماخذ حکایت ''الماس و زغال'' (اسرارِ خودی) سے دیکھے جا سکتے ہیں، جو تصنیف مندرجہ بالا کی حکایات[21] (پتھر و کوئلہ) سے ماخوذ ہے مگر چونکہ اقبال نٹشے سے بزرگ تر شاعر ہے، اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا ہے کہ الماس اس کا اپنا بن گیا ہے۔

نٹشے کی طرح اقبال بھی حریت فکر و فعل کا حامی ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرات سے سرفراز کیا ہے۔ اس کی حیات افروز مثنویوں کا حیرت انگیز اثر ہوا ہے۔ وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے:

''میں اسی طرح مرد و عورت کو چاہتا ہوں، ایک جنگ کے قابل اور دوسری امومت کے لائق۔''

نسائیت اقبال کے نزدیک امومت کے ہم معنی ہے۔[22] ''اے لوگو! ڈرو اپنے خدا سے جس نے تمھیں ایک نفس سے پیدا کیا اور تمہارے جوڑے پیدا کیے۔ اور پھر ان دونوں سے کئی مرد اور عورتیں پیدا کیں۔''[23] اور نسائیت کے لیے اسوۂ کاملہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ وہ دختر رسولؐ، بتول علیؓ اور امِ حسینؓ شہید کربلا ہیں۔ جب شاعری کی آنکھ عورت پر پڑتی ہے، تو وہ اس سے پرے خاتون جنت کو دیکھتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی آنکھیں دن رات اپنی اولاد کو دیکھتی ہیں، اور اسلامی دُنیا پر بارش ضیا و نور کی رہی ہیں۔[24]

عفت و عصمت مستورات وہ بنیادی پتھر ہے جس پر مذہب اور سیاست کی دیواریں قائم ہیں۔ آج کل کی نام نہاد آزاد عورت جو ایک محدود خاندان میں یقین رکھتی ہے، سلطنت کے زوال اور مذہب کے ادبار کی نشانی ہے۔[۲۵] اقبال نے ایک نہایت اہم سوال کو چھیڑا، مگر اس نوعی بحث کو طول دینے سے احتراز کیا، اور اس کے جملہ پہلوؤں کو منظرِ عام پر لانے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ بہت لطف ہو، اگر وہ نسائیات کے بعض مسائل کی توضیح کر دیں، مثلاً مرد اور عورت کے لیے گیر مساوی شرائط نکاح یا پھر فقہائے قدیم کے اُصولوں کی کوئی نئی تاویل و توجیہ پیش کریں۔

اقبال بعض معاملات میں روسو[۲۶] کی مانند ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پھر سے عہدِ نبوی کے شاندار شب و روز آ جائیں، اس کے تمام خیالات اسی ایک خواب کی تعبیر ہیں۔ روسو فطرت کی طرف جانا چاہتا ہے۔ اقبال دشتِ حجاز پر مٹا ہوا ہے، اس کا دل دکھتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان تہذیبِ حاضرہ کے تصنع اور چمک دمک سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں، جس میں سطحی اور تعیش کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی روایات عربی ہیں، اس لیے انھیں اپنے شریفانہ جذبات اور قدرتی فطانت کو برقرار رکھنا چاہیے۔ یورپ کی نقل کسی طرح سودمند نہیں ہو سکتی، جیسا کہ ایرانی اوضاع و اطوار نے ماضی میں کچھ فائدہ نہیں پہنچایا۔ غیر ملکی خیالات کا مبالغہ آمیز اور غلامانہ تتبع ہر ایک قوم کے لیے مہلک ثابت ہوا۔[۲۷]

لیکن اسلامی سوسائٹی ان پُرانی روایات پر پھر سے کیسے قائم کی جا سکتی ہے۔ ''تاریخ قوم کے لیے وہی کام دیتی ہے، جو حافظہ فرد کے لیے۔'' مسلمانوں کی تمام حیاتِ ماضی، ان کے تمام محسوسات و مزعومات، عزائم اور کامیابیاں، اس دن سے جب ان میں قومی و مذہبی زندگی کا احساس پیدا ہوا، اوراقِ تاریخ میں غیر فانی طور پر محفوظ ہیں اور تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانا چاہیے۔[۲۸] زندگی کو سادہ بناؤ، اس میں جھوٹے تصنع، فرقہ وارانہ خیالات اور غیر مخلصانہ و خود غرضانہ خواہشات کا گزر نہ ہو۔ اخلاقی، دماغی اور سیاسی بزدلی جو آج اسلام کی انفرادی حیثیت کی جڑیں کاٹ رہی ہے، اسے دور کرو۔

اس کے معنی رجعتِ قہقری نہیں۔ مصلح کا کام ماضی سے شاندار عہد کی جانب رہنمائی کرنا ہے۔ اس سے مراد شادہ اخلاق، زندگی پر ایک مردانہ نظر اور عرب کی شجاعانہ جانبازی کا ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی عصبیت پیدا کر کے ان کے دلدر کاٹنا ہے۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کی بزدلی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکوں۔

جب مثنویوں کا علم کلام ہر جگہ سمجھ میں آ جائے، تو تمام اسلامی دُنیا میں وہ لہر چلے گی جس کا نتیجہ نہایت شاندار ہے۔ اقبال ایک پیغام بر ہے، وہ اسلام کے شاندار اور بے نظیر زریں ماضی اور مستقبل میں اس کی معاودت کا نظارہ کرتا ہے۔ مگر وہ مستقبل ایسا ہے جیسے اس کے ہر طرف دھند چھائی ہے، اگرچہ دھند گہری

نہیں ہے۔

بعض دفعہ اس ملک میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ آخر مثنویوں کو اُردو کی بجائے فارسی میں لکھنے سے کیا فائدہ مترتب ہوگا؟ اقبال ان لوگوں میں سے ہے جو گا ہے گا ہے ایک پیغام اور ایک مقصد کے ساتھ منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ اس کا پیغام تمام اسلامی دُنیا کے لیے ہے۔ اس کی مثنویاں بچوں کے مدارس میں سعدی کی گلستاں اور دہلی، کابل، طہران، قاہری، قازان، استنبول، مدینہ اور مکہ کی جامع مسجدوں کے منبروں پر مثنوی مولانا روم کی جگہ استعمال کرنے کے لیے ہیں۔

مثنویاں بحر رمل مسدس مقصود میں لکھی گئی ہیں۔ بحر رمل میں یہ تبدیلی غزل اور مثنوی میں متداول ہے۔ مثنوی معنوی بھی اسی بحر میں لکھی ہوئی ہے۔ پہلی مثنوی (اسرارِ خودی) زیادہ حقیقی ہے، دوسری (رموزِ بے خودی) زیادہ تخیلی ہے۔ رموز میں اگر تھوڑی سی حکایتیں اور ہو جاتیں، تو دماغ پر اس کی بھی وہی حقیقی گرفت ہوتی جو اسرار کی ہے۔ یہ کمی رموز کے نصف آخر میں خصوصاً بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی ایسا نقص نہیں جو مصنف دور نہیں کر سکتا ہے۔

اقبال نے فارسی ادبیات کی جھوٹے مصنوعی ادب القدما سے اصلی ادب القدما کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ صائب کے بعد کے شعرا عہد زریں کا ایک غیر شعوری اور مدھم سی گونج رہ گئے تھے۔ اقبال کا پھر سے اساتذۂ قدیم کی روش اختیار کرنا اس وجہ سے ہے کہ وہ بیدل اور اس کے متبعین کی شاعری کے خلاف ہے، جو رنگین پردوں میں لپٹی ہوئی ہے جس میں حسن و کشش تو ہے مگر قوت و عمل نہیں۔ اس کا طرز تحریر مولانا روم کا ہے۔ لیکن الفاظ ایسے ہیں جیسے کسی مرصع تلوار کے دستہ میں موتی جڑے ہوں۔ لیکن باوجود اپنے اس عظیم الشان پیش رو کی تقلید کے اقبال یقیناً بیسویں صدی کی پیداوار ہے، نو بیدار مشرق کی رُوح ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اور اقبال کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس نے ایرانی شاعری کی واماندہ رگوں میں خون تازہ دوڑا دیا ہے۔ اور حسن صوری کے ساتھ قوت معنوی کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ مثنویوں کی زبان بہت پر شوکت ہے، لیکن اس مردانگی کے باوجود اس میں لوچ اور لچک ہے۔ آج جبکہ فارسی زبان خود اپنے وطن میں اس قدر بدنما ہو گئی ہے، اقبال اس کے شباب کی یاد دلاتا ہے۔ فارسی ادب ایک خطرناک دور سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف جب خود ایران میں ادبی انحطاط نمایاں ہے دوسری طرف ایک موسیٰ نے اپنے عصا سے چٹان کو ضرب لگائی ہے اور ایک نیا کوثر پھوٹ بہا ہے، جو بنی اسرائیل کے بارہ چشموں سے کسی طرح کم نہیں۔[۲۹]

(نیرنگ خیال، اقبال نمبر ۱۹۳۲ء)

حواشی و حوالہ جات

۱- اس مضمون کو علامہ ممدوح نے ''حکایت طائرے کے از تشنگی بے تاب بود'' اور حکایت ''الماس و زغال'' میں بیان فرمایا ہے۔ موخر الذکر میں جب کوئلہ الماس سے پوچھتا ہے کہ باوجودیکہ ہماری پیدائش ایک کان سے ہوئی ہے، کیا وجہ ہے کہ تو سرتاج شہنشاہاں ہوتا ہے اور میں انگیٹھی میں جلتا ہوں۔ تیری قدر ہوتی ہے اور میں ہر جگہ ذلیل ہوں:

گفت الماس اے رفیق نکتہ بیں
تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں
تا بہ پیرامون خود در جنگ شد
پختہ از پیکار مثل سنگ شد
پیکرم از پختگی ذوالنور شد
سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد
خوار گشتی از وجود خام خویش
سوختی از نرمئی اندام خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثل سنگ شو الماس باش
می شود از روئے عالم مشیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشت خاکے اصل سنگ اسود است
کہ سر از جیب حرم بیروں زدست
البتہ از طور بالا تر شد است
بوسہ گاہ اسود و احمر شد است
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی نا پختگی است

۲-

تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینہ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ماسوٰی قطع نظر
میں نہد ساطور بر حلق پسر
با یکی مثل ہجوم لشکر است
جاں بچشم او زباد ارزاں تر است

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

اے کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر
ایں سبق صدیق را صدیق کرد
سر خوش از پیمانہ تحقیق کرد
از رضا مسلم مثال کوکب است
در رہ ہستی تبسم بر لب است
گر خدا داری زغم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو
قوت ایماں حیات افزایدت
ورد 'لا خوف علیہم'' بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلب او از ''لا تخف'' محکم شود
بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروان زندگی را رہزن است
بیم جاسوسے است از اقلیم مرگ
اندرونش تیرہ مثل میم مرگ
ہر شر پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست
ہر کہ رمز مصطفیؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

یہی مضمون محاورہ ''تیر و شمشیر'' اور حکایت ''شیر و عالمگیر'' میں بیان کیا گیا ہے۔ آخر الذکر کے دو شعر درج ذیل ہیں:

عشق را آتش زن اندیشہ کن
روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس
خوف غیر از شرک پنہاں است و بس

۳-

شاہ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبار دودماں گورگاں
درمیاں کارزار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں
در صف شاہنشہاں یکتاستے
فقر او از تربتش پیداستے
روزے آن زیبندۂ تاج و سریر
آن سپہدار و شہنشاہ و فقیر
صبحگاہاں شد بہ سر بیشہ اے
با پرستارے وفا اندیشہ اے
سرخوش از کیفیت باد سحر
طائران تسبیح خواں بر ہر شجر
شاہ رمز آگاہ شد محو نماز
خیمہ بر زد در حقیقت از مجاز
شیر ببر آمد پدید از طرف دشت
از خروش او فلک لرزندہ گشت
بوئے انساں دادش از انساں خبر
پنجہ عالمگیر را زد بر کمر
دست شہ نادیدہ خنجر برکشید
شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود راہے نداد اندیشہ را
شیر قالیں کرد شیر بیشہ را
باز سوئے حق رمید آں ناصبور
بود معراجش نماز با حضور

این چنیں دل خود نما و خود شکن
دارد اندر سینہ مومن وطن
تو ہم اے نادان دلے آور بدست
شاہدے را محملے آور بدست

۴- اندرد قلس اور شیر کی کہانی مشہور ہے:
اندرد قلس روما کا ایک رم خوردہ غلام تھا۔ اس نے ایک غار میں پناہ لی۔ اچانک اس غار میں ایک شیر بھی داخل ہوا اور بجائے غلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے اپنا پاؤں اس کے سامنے رکھ دیا جس میں کانٹا چبھا تھا۔ غلام نے وہ کانٹا نکال دیا اور شیر چلا گیا بعد میں غلام گرفتار ہوا اور حسب قانون اسے شیر کشتی لڑنے کا حکم ہوا۔ حسن اتفاق کہ اس کے مقابل وہی شیر چھوڑا گیا جس کا کانٹا اس نے نکالا تھا۔ جب شیر اس پر جھپٹ کر آیا تو اسے پہنچانتے ہی فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے پیر چاٹنے لگا۔ جب حکام نے یہ نظارہ دیکھا تو غلام کو آزاد کر دیا۔ ایک اسی طرح کا واقعہ برطانوی سفیر روما سر جارج ڈیوس کا بھی ہے۔ لیکن طوالت سے خالی نہیں۔ اس لیے چھوڑتا ہوں۔

۵- مساوات اسلامی کا مضمون نہایت تفصیل سے رموز کے باب رسالت میں درج ہے۔ میں صرف ''حکایت سلطان مراد ومعمار'' سے چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں:

بود معمارے ز اقلیم خجند
در فن تعمیر نام او بلند
ساخت آں صنعت گر فرہاد زاد
مسجدے از حکم سلطان مراد
کوش نیامد شاہ را تعمیر او
خشمگیں گردید از تقصیر او
آتش سوزندہ از چشمش چکید
دست آں بیچارہ از خنجر برید
جوئے خوں از ساعد معمار رفت
پیش قاضی ناتوان و زار رفت
آں ہنر مندے کہ دستش سنگ سفت
داستاں جور سلطان باز گفت
قاضی عادل بدنداں خستہ لب
کرد شہ را در خود طلب
رنگ شہ از ہیبت قرآں پرید
پیش قاضی چوں خطا کاراں رسید
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام
اعتراف از جرم خود آوردہ ام

گفت قاضی فی القصاص آمد حیواۃ
زندگی گیرد بایں قانوں ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست
خون شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید
دست خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند
آیۂ بالعدل و الاحسان خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش
از برائے مصطفیٰ بخشیدمش
یافت مورے برسلیمانے ظفر
سطوت آئین پیغمبرؐ نگر
پیش قرآن بندہ و مولا یکے ست
بوریا و مسند دیبا یکے ست

۶- رالف والڈو ایمرسن (۱۸۰۳ء-۱۸۸۲ء) امریکہ کا مشہور مصنف، انیسویں صدی کے اخلاقیات پر اس کی تصنیفات اور تعلیم نے نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اس کا فلسفہ خود اعتمادی وخود داری اور اس کا رُوح کے احکام کی پابندی پر زور دینا بہت مؤثر ثابت ہوا ہے اور حال اس کے خیالات کا دائرہ اثر ترقی پذیر ہے۔

۷-

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیلہائے ما فرماں رواست
جام او خواب آور و گیتی رباست
گوسفندے در لباس آدم است
حکم او برجان صوفی محکم است
عقل خود را بر سر گردوں رساند
عالم اسباب را افسانہ کواند
کار او تحلیل اجزائے حیات
قطع شاخ سرد رعنائے حیات
فکر افلاطوں زیاں را سود گفت

حکمت او بود را نابود گفت
بسکہ از ذوق عمل محروم بود
جان او وارفتہ و معدوم بود
منکر ہنگامہ موجود گشت
خالق اعیان نامشہود گشت
زندہ جاں را عالم امکاں خوش است
مردہ دل را عالم اعیان خوش است
آہوش بے بہرہ از لطف خرام
لذت رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقت رم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوق روئیدن ندارد دانہ اش
از تپیدن بے خبر پروانہ اش
قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوق عمل محروم گشت

۸- واذ قال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفة (البقرہ-۳۰)

۹- بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افلاطون، اس کے فلسفہ اور فلاطینوس اور افلاطونیت جدیدہ (اشراق) کی نسبت کچھ تھوڑا سا لکھ دیا جائے۔ کیونکہ یہ لفظ مضمون میں اکثر استعمال ہوئے ہیں:

(الف) افلاطون (۴۲۹-۳۴۷ ق م) وہ سقراط کا شاگرد تھا۔ اس کا اصلی نام ارسطاقلس تھا۔ مگر اس کے چوڑے چکلے سینے کی وجہ سے سقراط نے اس کا نام افلاطون رکھا۔ اس نے فلسفہ کو تین شاخوں میں تقسیم کر دیا۔ اخلاقیات، منطق (ما بعد الطبیعیات) اور الہیات۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے تمام مخلوق کو اپنی شکل پر بنانے کا خیال کیا۔ اس نے پہلے رُوح کو بنایا جو محسوس اور معقول کے درمیان توصل کا کام دیتی ہے۔ اس رُوح کے ساتھ اس نے جسد خاکی کو ملایا۔ رُوح جسم کے تین حصوں میں رہتی ہے۔ دماغ، دل اور انتڑیاں، اور ان سے بالترتیب عقل، جوصلہ اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ وہ خدائی کی طرح مادّہ کو بھی ازلی مانتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام علم اپنی انتہا میں واحد اور آزاد ہے۔ خدا تمام چیزوں کا معیار ہے۔ اور اس میں ہی ہمت اور عقل کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور قدرت میں جو کچھ اصلی ہے اور جو خیالات وقوانین کا مجموعہ ہے خدا سے نکلا ہے۔ اس کا مسئلہ اعیان نامشہود مشہور ہے۔ اس کی کتاب ''الجمہوریت'' اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ اور اس کے نصب العین سیاسیات کو واضح کرتی ہے۔

(ب) فلاطینوس (۲۰۳ یا ۲۰۴ میں پیدا ہوا اور ۲۶۲ اور ۲۷۰ کے درمیان فوت ہوا) نے افلاطونیت جدیدہ کو مرتب کیا۔ اپنے خیال میں وہ افلاطون کا شارح اور متبع تھا۔ مگر اس کے خیالات اپنے پیشرو سے کچھ اس قدر مختلف ہیں کہ افلاطون سے اس کی نسبت بھی غلطی ہے۔ فلاطینوس کے فلسفہ کی قدر و قیمت اس کے خیالات کی وجہ سے نہیں بلکہ بوجہ اپنی تاریخی اہمیت اور بعض انسانی طبائع کے تجزیہ کی وجہ سے ہے۔ افلاطون کے نزدیک عقل میں جو کچھ بہترین اور اعلیٰ ترین ہے،

اس کا نام خیر ہے۔ فلاطینوس خیر کو تجرید محض خیال کرتا ہے۔ افلاطون انسانی اخلاق کی معراج عقل انسانی کے ذریعہ تتبع خداوندی قرار دیتا ہے۔ فلاطینوس تتبع اور خود صفات اللہ کو بنگاہ حقارت دیکھتا ہے اور انسانی مطمح نظر ادغام بر الہ یقین کرتا ہے۔ فلاطینوس کے نظریہ کے مطابق رُوح اپنے مبداء سے ایسے ہی نکلی ہے جیسے سورج سے شعاعیں، اور اب غیر ارادی طور پر اپنے منبع کو دیکھنے کے لیے تگ و دو کر رہی ہے۔ اس حرکت میں اس سے تصور اور تصور سے خیال پیدا ہوتا ہے۔ یہ خیال انسانی رُوح کا آفرینندہ ہے۔ مادّہ خیر کا زیریں ترین مقام ہے اور اسی کی ارتقائی حالت خیر ہے۔ وہ انسان اور خدا کے درمیان بلا واسطہ تعلق کا قائل ہے۔

۱۰- ابوالندیم۔

۱۱- ابوالفتح محمد الشہر ستانی۔ مصنف کتاب الملل والنحل جس میں مختلف سنی فرقوں کا حال بالتفصیل درج ہے۔ کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ سال وفات ۱۱۵۳ء مطابق ۵۴۸ھ۔

۱۲- شیخ احمد سرہندی کا لقب مجدد الف ثانی ہے۔ شیخ عبدالوحید فاروقی سرہندی کے فرزند ارجمند تھے۔ سرہند ۱۵۶۳ء مطابق ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے مشہور ولی اللہ خواجہ باقی اللہ کے مرید تھے۔ ان کا یقین تھا کہ ہر ہزار سال کے بعد ایک شخص ایسا پیدا ہوتا ہے، وہ تمام علومیہ اسلامیہ میں کامل اور طاقت وشوکت اسلام کا بڑھانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ دعویٰ کرتے تھے کہ دوسرے ہزار سال کا مجدد میں ہوں۔ ۱۶۲۴ء مطابق ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی۔ مقبرہ سرہند میں ہے۔

۱۳-

در شریعت معنی دیگر مجو
غیر ضو در باطن گوہر مجو
ایں گہر را خود خدا گوہر گر است
ظاہرش گوہر بطونش گوہر است
علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقات یقیں
پختہ تر از دے مقامات یقیں
ملت از آئین حق گیرد نظام
از نظام محکمے خیزد دوام
با تو گویم سر اسلام است شرع
شرع آغاز است وہ انجام است شرع
شارع آئین شناس خوب و زشت
بہر تو ایں نسخہ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب می سازدت
جانے کوبے در جہاں اندازدت

خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دین مصطفٰی دین حیات
شرع او تفسیر آئین حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آن سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دل آہن رباید زنگ را

۱۴- فلسفۂ عمل علامہ کا بڑا دل پسند موضوع ہے۔ اُنھوں نے اپنی تمام کتابوں میں اس کی تعلیم دی ہے، اور ہر جگہ نئے انداز سے دی ہے۔ اگر جگہ تنگ نہ ہوتی تو دوسری کتب سے حوالہ جات پیش کرتا مگر:

دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

صرف اسرار و رموز ہی پر اکتفا کرتا ہوں، اور وہ بھی صرف ایک جگہ سے۔ ضرورت ہے کہ ناظرین کتاب کو خود نگاہ غائر مطالعہ کریں:

اے ز جور چرخ ناہنجار و تنگ
جام تو فریادی بیدار سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا
سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمون حیات
لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جہان تازہ شو
شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہان نا مساعد ساختن
ہست در میدان سپر انداختن
مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیاد موجودات را
می دہد ترکیب نو ذرات را
می کند از قوت خود آشکار
روزگار تو کہ باشد سازگار

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست
آزماید صاحب قلب سلیم
زور خود را از مہمات عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
حربہ دوں ہمتاں کین است و بس
زندگی را ایں یک آئین است و بس
زندگانی قوت پیداستے
اصل او از ذوق استیلاستے
عفو بیجا سردی خون حیات
سکتہ اے در بیت موزدن حیات
ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

۱۵- سقراط (۴۶۹-۳۹۹ ق م) یونانی فلسفی۔ افلاطونی کا اُستاد۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اپنے نفس کو جانو یعنی اپنی انا کا اندازہ کرو۔ رُوح کی تعریف وہ یوں کرتا ہے، ہماری وہ چیز جو علم بھی رکھتی ہے اور بے علمی بھی، خیر بھی اور شر بھی۔ اپنی خدا پرستی کی وجہ سے زہر سے ہلاک ہوا۔

۱۶- اپیکرس (۳۴۲-۲۷۰ ق م) یونانی فلسفی۔ اس کی تعلیم کا اُصول یہ تھا کہ چونکہ خوشی اور غم ہی دُنیا کے خیر و شر ہیں لہٰذا فلسفہ کا مقصد اولیٰ حصول مسرت اور انعدام کلفت ہونا چاہیے۔ اس کے نزدیک سکون قلب مبنی بہ مراقبہ خیر پر منتج ہوتا ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ اس کی تعلیم ''کھاؤ پیو اور خوش رہو'' ہے غلط فہمی پر مبنی ہے۔

۱۷- حضرت علامہ نے ایک جگہ ایسے پیروں کی نہایت صحیح شکل کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

شیخ در عشق بتاں اسلام باخت
رشتہ تسبیح از زنار ساخت
پیر ہا پیر از بیاض مو شدند
سخرہ بہر کودکان کو شدند
دل ز نقش لا الہ بیگانہ اے
از صنمہائے ہوس بت خانہ اے
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش
آہ زیں سوداگران دیں فروش

با مریداں روز و شب اندر سفر
از ضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثل نرگس اند
سینہ ہا از دولت دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصف پرست
اعتبار ملت بیضا شکست
واعظ ما چشم بر بتخانہ دوخت
مفتی دین مبیں فتویٰ فروخت
''چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما
رخ سوئے مے خانہ دارد پیر ما''

۱۸- میکیاولی (۱۴۶۹ء-۱۵۳۷ء) اطالوی مورخ وسیاس۔ وہ فلارنس میں پیدا ہوا۔ اور وہاں مدتوں ریاست میں مناصب جلیلہ پر سرفراز رہا۔ آخر معطل کیا گیا اور اپنے جا گیری بندوبست میں بقیہ عمر بسر کی۔ اس کی ''کتاب الملوك'' سب سے پہلے ۱۵۳۲ء میں پوپ کلیمنٹ ہفتم کی اجازت سے شائع ہوئی۔ اس میں اس نے سیاسیات اور اخلاقیات کے درمیان ایک حد فاصل قائم کی۔ اور اس میں زمانہ حال کے کئی سیاسین نے اس کی تقلید کی ہے، وجو اپنی سیاسی اغراض ومقاصد میں اُصول اخلاق کو دخل نہیں دیتے۔ حضرت علامہ اس کی نسبت سے فرماتے ہیں:

دہریت چوں جامہ مذہب درید
مرسلے از حجرت شیطاں رسید
آں فلارنساوی باطل پرست
سرمہ او دیدۂ مردم شکست
نسخہ اے بہر شہنشاہاں نوشت
در گل ما دانہ پیکار کشت
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رخت
حق ز تیغ خامہ او لخت لخت
بت گری مانند آزر پیشہ اش
بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دین او معبود ساخت
فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد
نقد حق را بر عیار سود زد
باطل از تعلیم او بالیدہ است
حیلہ اندازی فنے گرویدہ است

طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت
ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بہ چشم اہل عالم چیدہ است
مصلحت تزویر را نامیدہ است

۱۹- دانتے (۱۲۶۵ء-۱۳۲۱ء) اٹلی کا بزرگ ترین شاعر ہے۔ اس کی ڈیوائن کو میڈی (طربیہ الٰہی) مشہور و معروف ہے۔ اس میں مصنف نے طبقات علوی کی سیر کا حال بیان کیا ہے۔ اسے اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دوزخ، دارالکفارۃ اور جنت۔ وہ خواب دیکھتا ہے کہ میں ایک گھنے جنگل میں جا نکلا ہوں، جہاں ورجل (اس سے پہلے کا ایک اطالوی شاعر) کا ہیولا ظاہر ہوتا ہے اور دوزخ اور دارالکفارۃ میں اس کی رہنمائی کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ دوزخ کے جو نظارے دانتے نے بیان کیے ہیں، بلحاظ وقت نظر، اعتقاد تامہ اور جزئیات کرداری نگاری غالبًا بے نظیر ہے اور شاید کسی ایک مصنف کے کلام میں اتنی خوبیاں بیک وقت نہیں ملیں گی۔ دارلکفارۃ میں نظارے تقریباً وہی ہیں البتہ سزا و عقوبت عارضی ہے۔
جنت سماوی میں اس کا رہبر اس کی معشوقہ بطریس ہے۔ سات طبقوں کی سیر کے بعد وہ آٹھویں طبقہ میں پہنچتا ہے۔ جہاں حضرت یسوع مسیح کو اپنے صاحب عظمت حواریوں کے حلقہ میں دیکھتا ہے۔ نویں طبقہ میں وہ اپنے آپ کو رُوح کل کی موجودگی میں محسوس کرتا ہے۔ اور ارواح مرحومہ کو ایک لامحدود دائرہ میں تختوں پر بیٹھا ہوا دیکھتا ہے۔ خداوند تعالیٰ خود دسویں طبقہ میں، جسے وہ وفور نور کے باعث نظارہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام رؤیائی تجربات کی بنیاد دراصل اعتقاد حسن، خیر و زشت، شر اور محبت کی عالمگیری اور قدرت عظیمہ ہے۔ اور یہ سب کچھ اس جوش و خروش اور صحت کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ الہام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مدتوں اس کے ہم وطنوں کا یہ خیال رہا کہ یہ تمام حالات الہامی ہیں۔

۲۰-

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفال جام ماست
رومی و شامی گل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او بجز اسلام نیست
زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم
خویش را در خاکداں گم کردہ ایم
مسلم استی دل باقلیمے مبند
گم مشو اندر جہان چون و چند
می نہ گنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دل او یاوہ گردد شام و روم
عقدۂ قومیت مسلم کشود

از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطان دین
مسجد ما شد ہمہ روئے زمین
آں کہ در قرآں خدا او را ستود
آں کہ حفظ جان او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش
لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویان حق ز ما پوشیدہ اند
معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است
صورت ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قید مقام آزاد شو
از فریب عصر نو ہشیار باش
رہ فتد اے راہبر و ہشیار باش

۲۱- فریڈرک نٹشے (۱۸۴۴-۱۹۵۰ء) جرمن شاعر اور فلسفی۔ لیکن چونکہ وہ اصل میں شاعر تھا، اس لیے اس کے نزدیک فلسفہ بھی ندگی اور فکر کی تنقید ہی ہے۔ اس کے خیال میں تمام مخلوق میں جس میں انسان بھی شامل ہے، آرزوئے حیات سب سے زیادہ ہے، جس کے معنی کہ طاقت حاصل کی جائے اور تمام رکاوٹوں کا قلع قمع کیا جائے جو زندگی کو مشکل بناتی ہیں۔ موجودہ انسان مخلوق خداوندی کا منتہائے مقصود نہیں، بلکہ جیسے جانور کی ارتقائی صورت انسان ہے، ایسے ہی انسان بھی عارضی ہے۔ اور اس کے بعد مکمل انسان (فوق البشر) ہوگا، جس میں حسن و طاقت، عقل و اخلاق، قوت ارادی و عمیق نگاہ بدرجہ کمال ہوں گے۔ اور ان الفاظ کے معنی بھی ان کے موجودہ مطلب سے کچھ زیادہ وسیع ہوں گے۔ محبت، رحم اور ہمدردی اس کے لیے بے معنی الفاظ ہیں۔ اس کے نزدیک فطرت ان الفاظ سے مبرا ہے اور مندرجہ بالا مقصود کی طرف بغیر دائیں بائیں دیکھے جاری ہے۔
اس طرح گویا اس نے انتہا درجہ کی انفرادیت کی تعلیم دی جس میں زندگی کی نسبت مقصد حیات گنا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اشتراکیت اور فوضویت، مساوات سیاسی اور حکومت عوام کالانعام کے سخت خلاف ہے۔
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جرمنوں کی موجودہ ذہنیت کے لیے بہت حد تک وہ ذمہ دار ہے اور گزشتہ جنگ عظیم کی تہہ میں اسی کی تعلیم تھی۔

۲۲-

نغمہ خیز از زخمہ زن ساز مرد
از نیاز او دو بالا ناز مرد
پوشش عریانی مرداں زن است
حسن دلجو عشق را پیراہن است
آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر اور فرد با طیب و الصلوٰۃ
نیک اگر بنی اومومت رحمت است
زانکہ او را با نبوت نسبت است
از امومت پختہ تر تعمیر ما
در خط سیمائے او تقدیر ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے
حرف امت نکتہ ہا دارد بسے
ملت از تکریم ارحام است و بس
ورنہ کار زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتار حیات
از امومت کشف اسرار حیات
از امومت پیچ و تاب جوئے ما
موج و گرداب و حباب جوئے ما

۲۳- یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا و بث منھما رجالًا کثیراً و نساء۔ (نساء آیت ۱)

۲۴-

سیرت فرزند ہا از امہات
جوہر صدق و صفا از امہات
مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یہودے چادرے خود را فروخت
نوری و ہم آتشی فرمانبرش
گم رضائش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا

آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامان نماز
اشک او بر چید جبریل از زمیں
ہمچو شبنم ریخت بر عرش بریں
رشتہ آئین حق زنجیر پاست
پاس فرمان جناب مصطفیٰ است

اسی سلسلہ میں ''خطاب بہ مخدرات اسلام'' بھی زیرنظر رہی۔

۲۵-

آں تہی آغوش نازک پیکرے
خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است
ظاہرش زن، باطن او نازن است
بند ہائے ملت بیضا گسیخت
تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش
از حیا نا آشنا آزادیش
علم او بار امومت بر نتاخت
بر سر شامش یکے اختر نتافت
ایں گل از بستان ما نارستہ بہ
داغش از دامان ملت شستہ بہ

۲۶- روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸ء) ایک عجیب انقلابی دل و دماغ کا مالک تھا۔ فرانس میں جب حکومت نے اس کو جلاوطن کیا تو انگلستان پہنچا۔ یہاں بھی ہوا راس نہ آئی، تو واپس فرانس آیا تو عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کے سخت مخالفین میں سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کی ابتدائی فطرتی حالت بہترین تھی۔ اس میں عجیب طور پر سرگرم جذبہ محبت و رافت کے ساتھ ساتھ تمام قائم شدہ اُصول وقواعد کے خلاف سخت مخالفانہ و جارحانہ خیالات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے لیے وہ بھی بہت حد تک ذمہ دار گردانا گیا ہے۔

۲۷-

اے میان کیسہ ات نقد سخن
بر عیار زندگی او را بزن
فکر روشن بیں عمل را راہبر است
چوں درخش برق پیش از تندر است

فکر صالح در ادب می بایدت
رفتن سوئے عرب می بایدت
دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبح حجاز از شام کرد
از چمن زار عجم گل چیدہ ای
نوبہار ہند و ایراں دیدہ ای
اند کے از گرمی صحرا بخور
بادۂ دیرینہ از خرما بخور
سر یکے اندر بہر گرمش بدہ
تن دمے با صرصر گرمش بدہ

مگر رموز میں اس سے اور بھی صاف اور واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت
قوم را رمز بقا از دست رفت
آں نہال سر بلند و اُستوار
مسلم صحرائی اشتر سوار
آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند
گشت از پامال مورے درد مند
آنکہ حزمش کوہ را کاہے شمرد
با توکل دست و پائے خود سپرد
کوشش او با قناعت ساز کرد
تا بہ کشکول گدائی ناز کرد
شیخ احمد سیّد گردوں جناب
کاسب نور از ضمیرش آفتاب
گل کہ می پوشد مزار پاک او
لا الٰہ گویاں دمد از خاک او
با مریدے گفت اے جان پدر
از خیالات عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت
از حد دین نبی بیروں گذشت
اے برادر ایں نصیحت گوش کن
پند آں آقائے ملت گوش کن

قلب را زیں حرف حق گرداں قوی
با عرب در ساز تا مسلم شوی

-۲۸

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ
داستانے قصہ پارینہ ؟
ایں ترا از خویشتن آ گہ کند
آشنائے کار و مرد رہ کند
رُوح را سرمایہِ تاب است ایں
جسم ملت را چو اعصاب است ایں
ہمچو خنجر بر فسانت می زند
باز بر روئے جہانت می زند
شمع او بخت امم را کوکب است
روشن از وے امشب و ہم دیشب است
چشم پر کارے کہ سیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را
ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضی تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو
موج ادراک تسلسل زندگی است
مے کشاں را شور قلقل زندگی است

۲۹- واذ استسقیٰ موسیٰ لقومه فقلنا اضرب بعصاك الحجر فانفجرت منه اثنتا عشرة عینا قد علم کل الناس مشربهم (البقرہ۶۰)

فلسفۂ بیخودی

رموزِ بیخودی کے تناظر میں مطالعہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہماری زندگی فی الحقیقت علائق اور نسبتوں کی ایک نامتناہی زنجیر ہے۔ جز وکل کا ربط ناگزیر ہے۔ وہ ہر چیز جسے ہم انسانی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تعیناتِ مخصوصہ کا نام ہے اور تعین کا وجود تسلسل سے ہے افراد کا جماعت سے تعلق ہوتا ہے، جز کی بحث ہو چکی۔ اب کل کے ساتھ اس کی نسبتوں پر نظر ڈالنی لازم آتی ہے، اقبال نے اس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے:

فرد و قوم آئینہ یک دیگراند
سلک و گوہر کہکشاں و اختراند

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل ست
قوتش آشفتگی را مائل ست

ملت کا قیام اختلاط افراد پر ہے اور اس کی تعمیر و تکمیل نبوت سے ہوتی ہے، جماعت کا حقیقی مفہوم نفس نبوت کا ترجمان ہے ہر شے خواہ وہ افراد سے متعلق ہو یا جماعت سے جب تک کوئی زندہ عقیدہ یا قانون اسے مربوط یا مستحکم نہ کرے، ربط کا کوئی حقیقی مفہوم پیدا نہیں ہوتا:

تا خدا صاحب دلے پیدا کند

کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازۂ
خاک را بخشد حیاتِ تازۂ

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند
محفلے رنگیں ز یک ساغر کند

بندہا از پا کشاید بندہ را
از خداونداں رہاید بندہ را

گویدش تو بندۂ دیگر نہٖ
زیں بتان بے زباں کمتر نہٖ

تا سوے یک مدعایش می کشد
حلقہ آئیں بپایش می کشد

ایک اسلامی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک اس عالم کی حقیقی نجات بہ الفاظ دیگر معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کامیابی وکامرانی اسلامی اصول کی پابندی اوران کے نفاذ سے وابستہ ہے۔ شاعری کا براہ راست کام یہ ہے کہ وہ جذبات کومتاثر کرے اور ایک مذہب پرست کا شیوۂ مذہبی عقائد کی ترویج وتلقین ہے وہ بھی اس طور پر کہ وہ اپنے عقائد کو محض عقائد کی حیثیت سے تسلیم کرائے۔ان نظریات کو ملحوظ رکھ کر اقبال کی شاعری پرنظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ باوجود شاعر اور مذہب پرست ہونے کے، انسانی ذہن وفکر کے میلانات طبعی کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ ارکان اسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ انسانی ذہن وفکر کا اسلام سے انحراف کرنا ناممکنات سے ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اپنے شعر وشاعری میں الفاظ اور ترکیبیں تو ضرور شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث واستدلال ایک فاضل حکیم کے انداز سے کرتے ہیں۔اسلام کے ارکان اساسی میں توحید، رسالت، نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کو مخصوص حیثیت حاصل ہے، آخر الذکر چار فرائض ایسے ہیں جو عمل سے متعلق ہیں، اقبال نے ان کے فلسفہ پر خیالات ظاہر کیے ہیں لیکن پہلے دو حقیقتوں یعنی توحید اور رسالت پر رموز بےخودی میں نہایت شرح وبسط سے بحث کی ہے، توحید اور رسالت کا تعلق چونکہ معتقدات سے ہے اور یہیں سے دوسرے شعبہ جات کی ابتداء ہوتی ہے۔اس لیے اقبال نے ان پر خصوصیت کے

ساتھ بحث کی ہے، کیونکہ توحید اور رسالت کو دیگر ارکان اسلامی سے وہی تعلق ہے جو بقیہ دفعات قانونی کو تمہید یا ''پری ایمبل'' سے ہوتی ہے فرماتے ہیں:

اہل حق را رمز توحید ازبر است
در اتیِ الرّحمٰن عبداً مضمر ست

دیں از و، حکمت ازو، آئیں ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

ملت از یک رنگیِ دلہاستی
روشن از جلوہَ ایں سیناستی

قوم را اندیشہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے

جذبہ باید در سرشتِ او یکے
ہم عیار خوب و زشتِ او یکے

گر نباشد سوز حق درساز فکر
نیست ممکن ایں چنیں انداز فکر

مدعاے ما، مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست

توحید ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو ان مکروہات سے محفوظ و مصئون رکھتی ہے جن میں اسیر ہو کر وہ زندگی کو پرآشوب تصور کرنے لگتا ہے۔ مایوس، محزوں یا مخوف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو انسان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے یا پھر وہ کسی ایسے حکیم و قادر کا قائل نہیں ہے جو نہ کبھی غلطی کرتا ہے اور نہ کبھی ظلم گوارا رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی کہ خود اعتمادی کا اصلی راز بھی اسی عقیدہَ توحید میں مضمر ہے، ہم کو اپنے اوپر اس لیے اعتماد نہیں ہے کہ ہماری قوت و حکومت کے ذرائع و وسائل نامحدود ہیں

بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ جہاں سے ہم قوت وقدرت حاصل کرتے ہیں وہ ایک ایسی ہستی اور حقیقت ہے جو کبھی غلطی یا زیادتی نہیں کرتی۔ اس لیے جب تک ہم اس حقیقت یا ہستی کی پیروی کریں گے ناکامیاب نہیں رہ سکتے۔ اقبال نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

مرگ را ساماں ز قطع آرزو ست
زندگانی محکم از لاتقنطُوا ست

اے کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لاتحزن بگیر

چوں کلیمے سوے فرعونے رَود
قلب او از لاتخف محکم شود

بیم غیراللہ عمل را دشمن ست
کاروانِ زندگی را رہزن ست

بیم چوں بندست اندر پاے ما
ورنہ صد سیل ست در دریاے ما

ہر شر پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم ست اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ہمہ از خوف میگیرد فروغ

ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اسلام سے پہلے، انسانی ذہن وفکر کو وہ آزادی حاصل نہ تھی جسے آج ہم علم وتہذیب کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں، انسان موجودات فطرت کی پرستش کرتا تھا اس لیے وہ کبھی اس پر جری نہ ہوسکا کہ ان کو اپنا تابع اور مسخّر بنائے چاند، سورج، برق و باراں، پہاڑ، دریائیں غرض کہ اس قسم کی تمام چیزیں اس کے نزدیک معبود کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ان کا کسی طور پر تجزیہ کرتا یا ان پر قدرت حاصل کرنے کی

جرات کرتا اس سے ترقی کر کے انسان نے انسان کی پرستش شروع کی، اس کی مختلف صورتیں تھیں، کبھی اس نے اپنی ہی نوع کو مذہبی حیثیت سے قادر مطلق گردانا اور کبھی کسی جابر قہرمان کے آگے جھکا، اس کا ایک نہایت دل نشین خاکہ رموز بے خودی میں اقبال نے یوں پیش کیا ہے:

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابودمند و زیر دست

سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش
بند ہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت
باج برکشت خراب او نوشت

در کلیسا اسقف رضواں فروش
بہر ایں صید زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

ایک دوسرے مقام پر اس کا اعادہ یوں کیا ہے:

فکر انساں بت پرستے بتگرے
ہر زماں در جستجوے پیکرے

باز طرح آزری انداخت ست
تازہ تر پروردگارے ساخت ست

کاید از خوں ریختن اندر طرب

نام او رنگ ست و ہم ملک و نسب

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو دنیا کو تفویض کی وہ یہ ہے کہ ہر انسان علم وعمل کے لیے آزاد ہے اس طور پر بقول اقبال اسلام کو ایک وسیع علمی تحریک قرار دینا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت تھی جس کو اسلام سے قبل طرح طرح سے مستور رکھا گیا۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے اس حقیقت کو فطری ہی طور پر برافگندہ نقاب بھی کیا، اس نے محض ایک مقولہ نہیں پیش کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ نمونہ بھی دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ بھی اس سہل اور سادہ انداز سے کہ معمولی سے معمولی عقل وتمیز بھی اس سے پوری طور پر آشنا ہو سکی۔ اسلام کے خدا نے اسلام کا محض اپنے کلام والہام سے اعلان نہیں کیا بلکہ اس کو جناب رسالت مآبؐ کی ذات میں ثابت بھی کر دیا۔ رسالت مآبؐ کے وجود وحیات سے نہ صرف یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کیا ہے بلکہ انسان کو کیا کرنا ہے اور جو کچھ کرنا ہے وہ کر بھی سکتا ہے، نظر برآں رسالت مآبؐ کی زندگی کو خدا سے وہی نسبت حاصل ہے جو انسانوں کو رسالت مآب سے حاصل ہے۔ اس لیے جہاں تک علم وعمل کا دخل ہے رسالت مآب کی زندگی ہم انسانوں کے لیے خدا کی ذات وصفات سے زیادہ قریب، زیادہ قابل تقلید اور زیادہ ممکن العمل ہے ممکن ہے اسی عقیدے کا اظہار اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہو:

معنی حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر

قوت قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی

رسالت مآبؐ نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل اپنے نمونۂ زندگی سے پیش کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''حریت'' ''مساوات'' و ''اخوت بنی نوع انسان'' کی بنیاد اس کا نمونہ اور اس کا مقصود ''رسالت محمدیہ'' تھی، عالم انسان کی نجات ان ہی ہر سہ حقیقتوں کی تشکیل وتعمیم میں مضمر ہے۔ حریت نے ہر انسان کو انفرادی طور پر آزاد کیا، مساوات نے ان سب کو باعتبار فطرت ایک سطح پر لا کھڑا کیا اور پھر ان دونوں کو جس نے دنیا کے لیے باعث رحمت وعافیت بنایا وہ ''اخوت بنی نوع انسان'' تھی۔ اسلام کے اصطلاحی اور محدود مفہوم سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان صفات کے اعتبار سے اسلام زمان ومکان دونوں کی قید سے آزاد ہے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو جس کی بنا پر اقبال کی زبان پر آیا ہو۔

پس خدا برما شریعت ختم کرد

بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

خدمت ساقی گری باما گذاشت
داد مارا آخریں جامے کہ داشت

حریت مساوات اور اخوت کی بنا پر قومیت کا جغرافیائی مفہوم بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ ''پین اسلامزم'' کا رمز ملک گیری میں نہیں بلکہ ''اخوت بنی نوع انسان'' میں مضمر ہے، ترکوں کا جدید رویہ جس کی بنا پر انھوں نے جمہوریہ ترکی کو ''وطنیت ترکیہ'' پر قائم کیا ہے اس بناء پر صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے ترک یا ترکی اور اسلام کو دو مختلف حیثیتیں دے دی ہیں۔ عزل خلافت سے انھوں نے اسلام کے مفہوم کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ خلافت کا کام یہ نہ تھا کہ اسلام کے دینی اقتدا کو دنیوی طاقت سے برقرار رکھا جائے بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دنیوی اقتدار کو ان پابندیوں سے بے نیاز نہ ہونے دیا جائے جن سے آزاد ہو کر حکومت اور اس کی نعمتیں محض ایک ہی قوم اور ایک ہی خطہ تک محدود نہیں رہ جاتیں بلکہ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک کے لیے موجب آزار ہوتی ہیں۔ حکومت ترکی نے وطنیت ترکیہ کے قائم کرنے میں یوں غلطی کی ہے کہ اس نے نہ صرف اسلام کی ہمہ گیری اور اس کے فیض عام کو ترکی تک محدود کر دیا اور شاید یہ بھی متیقن نہیں ہے۔ بلکہ ایک طور پر اس نے دوسرے اقوام کو بھی اسلام کی خوبیوں سے بے خبر رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اسلام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں آیا بلکہ یہ دوسرے اقوام اور دوسرے ممالک کے لیے بھی ایک پیام عمل و عافیت ہے، اسلام صرف اسلامیوں کے لیے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لیے ایک عام تبلیغ عمل ہے جس کو کسی صورت میں محدود نہیں کرنا چاہیے۔ ملت اسلامیہ زمان و مکان دونوں قیود سے آزاد ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام میں نسل و ملک کا کوئی مفہوم نہیں:

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفال جام ماست
رومی و شامی گلِ اندام ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست

مرز بوم او بجز اسلام نیست

مسلم استی دل بہ اقلیمے مبند
گم مشو اندر جہان چون و چند

می نگنجد مسلم اندر مرز بوم
در دل او یاوہ گردد شام و ردم

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقاے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد

ہجرت آئین حیات مسلم ست
ایں ز اسباب ثبات مسلم ست

صورت ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قید مقام آزاد شو

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بروطن تعمیر ملت کردہ اند

تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انساں را قبائل ساختند

مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

تاسیاست مسندِ مذہب گرفت
ایں شجر در گلشن مغرب گرفت
قصہ دین مسیحائی فسرد
شعلہ شمع کلیسائی فسرد

بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است
دوشہا خوں گشت و فردا باقی است

در سفر یار است و صحبت قائم است
فرد رہ گیر است و ملت قائم است

فرد بر می خیزد از مشت گلے
قوم زاید از دلِ صاحبدلے

گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد
از اجل فرماں پذیرد مثل فرد

امت مسلم ز آیات خدا ست
اصلش از ہنگامہ قَالُوا بَلٰی ست

از اجل ایں قوم بے پروا ستے
استوار از نَحنُ نَزّلْنَا ستے

سطوت مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

تو مگر از چرخ کج رفتار پرس
زاں تو آئین کہن پندار پرس

آتش تاتاریاں گلزار کیست؟
شعلہ ہاے او گلِ دستار کیست؟

رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشہ ساسانیاں درخوں نشست
رونق خمخانہ یوناں شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند

درجہاں بانگ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بود ست و ہست

ملت کی بنیاد اختلاط افراد پر ہے لیکن خود ملت کی شیرازہ بندی کے لیے بھی کسی آئین یا دستور کا وجود لازمی ہے۔ ایک ایسی ملت کے لیے جو تمام عالم کے لیے ابدالآباد تک ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہو ضروری ہے کہ اس کا آئین بھی اتنا ہی ہمہ گیر اور لازوال ہو، جیسا کہ اس سے پہلے کہیں آچکا ہے۔ افراد اور ملت دونوں کسی نہ کسی حد تک فنا پذیر ہیں لیکن مقصد حقیقی ان اسالیب عمل سے بلند و پائندہ تر ہوتا ہے، جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

فصل گل از نسترن باقی تر ست
از گل و سرو سمن باقی تر ست

کان گوہر پروری گوہر گرے
کم نہ گرد و از شکست گوہرے

ملّتِ اسلامیہ کا آئین قرآن مبین ہے۔ اقبال نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے:

نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستی
ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستی

در گلوے مانفس موج ہوا ست
چوں ہوا پابند نے گردد نواست

توہمیں دانی کہ آئین تو چیست؟
زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال ست و قدیم

حرف او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رَحمة لّلعَالَمِیْن

آنکہ دوش کوہ بارش برنتافت
سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

بنگر آں سرمایہ آمال ما
گنجد اندر سینہ اطفال ما

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اسی سلسلے میں اقبال نے ایک نہایت نازک لیکن اتنا ہی معرکہ آرا مسئلہ بھی پیش کیا ہے جس پر اس زمانہ میں صبر و ایمانداری کے ساتھ غور کرنا اتنا ہی ممکن معلوم ہوتا ہے جتنا یہ ضروری بھی ہے، یعنی زمانہ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے۔

آج بیرونی اثرات کے سیلاب اور مذہبی ناواقفیت (جس میں علم و عمل دونوں کا فقدان ہے) نے ہر شخص کو اس پر جری کر دیا ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم پر نظر ثانی کرے۔ کسی مسئلے پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالنا قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ آج اجتہاد کے علم بردار کہے جاتے ہیں اُن کے میلانات ذہنی یا استعداد علم و عمل کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل قوتیں برسر کار نظر آئیں گی جن کے موجود ہوتے ہوئے یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ ان نام نہاد اجتہادیوں کا طرز عمل صحیح نہیں ہے:

۱۔ عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب ہر حال میں مفید اور قابل تقلید ہے۔ اس وقت زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تہذیب یورپ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان مصنفین جو یورپین تہذیب اور خیالات سے باخبر کہے جاسکتے ہیں یا کہے جاتے ہیں، اپنے سامنے یہ حقیقت رکھ کر آگے بڑھتے ہیں کہ جو کچھ اس وقت یورپ میں تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مفید اور بہتر

خیال کیا جاتا ہے وہ اسلام کی تاریخ اور تہذیب سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اصول غلط بھی ہے اور خطرناک بھی۔

۲۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام کے بعض اصول کو کسی طور پر کمزور یا قابل اصلاح سمجھتے ہیں وہ خود اپنے علم و عمل کے اعتبار سے جامع نہیں کہے جا سکتے۔ جب تک اسلام اور مغربی اصول دونوں کا صحیح اور مکمل تجربہ نہ ہو اس وقت تک کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ یورپ کو اس وقت ایک حکمران کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے اس کو وہ سب فطری سہولتیں حاصل ہیں جو اس کے تہذیب و تمدن کو مقبول بنا سکتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں خالص اسلامی شریعت نافذ ہے وہاں اسلامی اصول کا نفاذ کہاں تک مفید یا مکمل ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو افغانستان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بعض حضرات ترکی کی مثال پیش کرنا زیادہ اہم سمجھیں گے۔ اب تک ترکوں یا کمالیوں کا اس بارۂ خاص میں جو رویہ رہا ہے۔ اسے ملحوظ رکھتے ہوئے بے تامل کہا جاسکتا ہے کہ ترکی سلطنت صحیح معنوں میں سلطنت اسلامیہ نہیں ہے بلکہ محض سلطنت یا ''وطنیت ترکیہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترکی نے جو نیا ورق پلٹا ہے اس کا کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو جن اسباب یا واقعات کی بنا پر اس نے اتنا زبردست انقلاب روا رکھا ہے وہ اسلام یا خلافت کی کوتاہیوں یا زیادتیوں کے سبب سے نہ تھا بلکہ اس کی اصلی وجہ خلفائے عثمانیہ یا دولت عثمانیہ تھی۔

۴۔ انحطاط کے زمانہ میں قوائے جسمانی و ذہنی دونوں پژمردہ ہو جاتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارنامے اپنے نظروں میں ناقابل رسائی معلوم ہونے لگتے ہیں، انسانی فطرت دشوار پسندی اور الولوالعزمی سے فطری طور پر کنارہ کش رہنا چاہتی ہے، قوم اور افراد دونوں فاتح کی حیثیت حاصل کرنے کی بجائے فاتحین کی ہمرکابی و ہمنوائی زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اقبال نے اس حالت میں تقلید کو اجتہاد سے بہتر بتایا ہے:

عہد حاضر فتنہ ہا زیر سر است
طبع نا پروائے او آفت گر ست

بزم اقوام کہن برہم ازو
شاخسار زندگی بے نم ازو

جلوہ اش ما را زما بیگانہ کرد
ساز مارا از نوا بیگانہ کرد

از دل ما آتش دیرینہ برد
نور و نار لَا اِلٰہ از سینہ برد

راہ آبا رو کہ ایں جمعیت ست
معنی تقلید ضبط ملت ست

اجتہاد اندر زمان انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط

ز اجتہاد عالمان کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

جس طور پر ہر عمل کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے خواہ یہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسی طور پر ملت اسلامیہ محمدی کا ایک نصب العین ہے اور وہ ''حفظ ونشر توحید'' ہے۔ افراد کو جو قوت جماعت کی شکل میں نمودار کرتی ہے۔ وہ کسی مخصوص مقصد کی تبلیغ یا تشکیل ہے اگر ایسا نہ ہو تو افراد اور جماعت کبھی ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہو سکیں اس لیے ''جمعیت'' کا مدار کسی مخصوص نصب العین کی تعمیر وتعمیم پر ہے لیکن ''حقیقی جمعیت'' اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب نصب العین بھی ہر طور پر مکمل و مستحسن ہو۔ اس عالم حیات کا اصلی راز تبلیغ توحید میں مضمر ہے اور چونکہ اسلام کو دین فطرت ہونے کا دعویٰ ہے اس لیے مقصد بھی اتنا ہی عالمگیر اور مقدس ہے:

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل
کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل

گردش خونے کے در رگہاے ماست
تیز از سعیِ حصول مدعا ست

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست

نالہ ہا درکشت جاں کاریدہ است
تا نواے یک اذاں بالیدہ است

نقطہ ادوار عالم لَا اللہ
انتہائے کار عالم لَا اللہ

زانکہ در تکبیر راز بود تست
حفظ و نشر لَا اِلٰہ مقصود تست

جلوہ در تاریکیِ ایام کن
آنچہ برتو کامل آمد عام کن

لرزم از شرم تو چوں روز شمار
پرسدت آں آبروے روزگار

حرف حق از حضرت مابردۂ
پس چرا بادیگراں نہ سپردۂ

حیات انسانی کے تمام افعال و مشاغل باعتبار تعینات ہمیشہ متشکل ہوتے رہتے ہیں اور یہ محض اس لیے کہ مزید سعی و کوشش کے لیے ایک نمونہ سامنے ہو اور یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہر سعی و حرکت کس طور پر اور کہاں تک بارآور ہوئے اور جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے کیا وہ اس پایہ کی ہے کہ اس کے لیے مزید کوشش کی جائے یا اس کے قائم رکھنے میں مزید تگ و دو روا رکھی جائے۔ گویا ہر مزید کوشش ابتدائی کوشش کے لیے ایک سند جواز ہے۔ اس طور پر گویا زندگی کی یہ سعی پیہم ایک مقصد و مرکز کے لیے ہے۔ حیات ملّیہ کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ''مرکز محسوس'' ہو، ملت اسلامیہ کا مرکز ''بیت الحرام'' ہے، اقبال نے اس تفصیل و تخصیص کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

در گرہ چوں دانہ دارد برگ و بر
چشم برخود واکند گردد شجر

خلعتے از آب و گل پیدا کند
دست و پاو چشم و دل پیدا کند

ہمچناں آئین میلاد امم
زندگی بر مرکزے آید بہم

حلقہ را مرکز چوجاں در پیکر ست
خط او در نقطۂ او مضمر ست

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دارِ راز ما بیت الحرام
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

دعویِ او را دلیل استیم ما
از براہین خلیلؑ استیم ما

در جہاں مارا بلند آوازہ کرد
باحدوث ما قدم شیرازہ کرد

تو ز پیوند حریمے زندۂ
تا طواف اوکنی پائندۂ

در جہاں جان امم جمعیت است
در نگر سر حرم جمعیت است

عبرتے اے مسلم روشن ضمیر
از مآل امت موسیٰؑ بگیر

داد چوں آں قوم مرکز راز دست
رشتۂ جمعیت ملت شکست

آج یورپ کی جو چیز ہم کو سب سے زیادہ قابل رشک معلوم ہوتی ہے وہ اس کے فرزندوں کی ''تسخیر قوائے نظام عالم'' ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک قوائے نظام عالم کو مسخر کرنے کا تعلق ہے یورپ کی ترقی بہر نوع مہتم بالشان ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس حقیقت سے آشنا ہیں یا آشنا ہونا پسند کرتے ہیں کہ جو ترقیاں علم و عمل کی آج نظر آرہی ہیں ان کی آج سے بہت پہلے مسلمانوں نے یورپ میں

ابتدا کی تھی۔ یورپ کو جو برکات مسلمانوں سے حاصل ہوئیں ان کے شمار کرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔اس کا اعتراف خود اہل یورپ کر چکے ہیں مسلمان اکثر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ وہ عام عالم اسلام پر اس وقت جو انحطاط رونما پاتے ہیں وہ اسلام کے اساسی تعلیمات کے سبب سے نہیں ہے بلکہ اس کا باعث مسلمان خود ہیں۔مسلمانوں سے پہلے یہ تعلیم کسی مذہب نے نہیں دی ہے کہ یہ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریائیں آبشار، برق و باد پرستش کے لیے نہیں ہیں۔ بلکہ انسان کے تابع کئے گئے ہیں اور وہ اس کے ذہن و فکر اور قوت عمل کی مختلف وسیع جولا نگاہیں ہیں۔اسلام تو ایک شریعت عمل تھا ہم نے اس کو یا تو متکلمین و معتزلہ کی ورزش دماغی سمجھ لیا یا پھر جاہل مولویوں یا واعظوں کا وسیلۂ رزق۔قوائے عالم کی تسخیر ڈرائینگ روم کی لطیف معصیتوں یا تکفیر کے فتوؤں سے نہیں کی جاسکتی اس کے لیے ضرورت تھی محنت اور قربانی کی جس سے ہم آج بھی بہت دور ہیں۔ ہم تو دوسروں کے ثمرۂ محنت سے مستفید ہونا ہی اپنا ایک بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام کی تعلیم کو محض ''راہ نجات'' یا ''بہشتی زیور'' کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک ایک زندہ جاوید پیغام عمل ہے جس سے منحرف رہ کر مسلمان ہی نہیں کوئی قوم دنیا میں زندہ یا کامیاب نہیں رہ سکتی۔حیات ملیہ اسلامیہ کا مقصد اسرار حیات کو اس طور پر برافگندہ نقاب کرنا ہے کہ دنیا میں امن و کامرانی کے امکانات وسیع ہوتے رہیں۔اس لیے حیاتِ ملّی کے لیے لازم ہے کہ اس کا مقصد عین تسخیر قوائے نظام عالم ہو۔اقبال نے اس کی تبلیغ یوں کی ہے:

اے کہ با نادیدہ پیماں بستۂ
ہمچو سیل از قید ساحل رستۂ

چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز
دل بغائب بند و حاضر ستیز

ماسوا از بہر تسخیر است و بس
سینہ او عرضہ تیر است و بس

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

کوہ و صحرا، دشت و دریا بحر و بر
تختۂ تعلیم ارباب نظر

نائب حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

آنکہ بر اشیا کمند انداخت ست
مرکب از برق و حرارت ساخت ست

علم اسما اعتبار آدم است
حکمت اشیا حصار آدم است

جس طور پر افراد کے لیے استحکام خودی ضروری ہے اسی طور پر حیات ملیہ کے لیے بھی ''احساس خودی'' لازمی ہے۔ جہاں تک ان اصول و عقائد کا تعلق ہے جن کے حفظ، تعمیم و تشکیل کا وسیلہ ملت اسلامیہ ہے یہ بحث اس سے پہلے آ چکی ہے کہ ہماری حیات کا مقصد اور اس کا دار و مدار لا اِلہ پر ہے لیکن امت کو جو نسبت رسول سے حاصل ہے وہ کئی حیثیت سے اہم ہے۔

خدا نے بعثت نبوی میں سب سے بڑا راز یہ رکھا ہے کہ وہ جو کچھ ہم بندوں سے کرانا چاہتا ہے اس کا ہم بندوں ہی میں سے نمونہ بھی پیش کر دیتا ہے تا کہ ہم اس کو اپنے لیے محض ایک آسمانی کرشمہ نہ سمجھیں جو بندوں کی فہم و ادراک یا ان کے سعی عمل سے بالا ہو۔ بلکہ ایک ممکن العمل حقیقت تصور کریں۔ ٹھیک اسی طور پر ملت کی ترقی و بقا کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم محض عقائد مجردہ کی علم برداری کرتے رہیں بلکہ ان روایات کا احترام کریں اور اس کو برقرار رکھیں جو ہمارے برگزیدہ اسلاف نے اپنے عمل سے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں اقبال نے اس کی تفصیل و توضیح ایک نوزائیدہ بچے سے کی ہے جو ابتداً ہر شے سے ناآشنا ہوتا ہے اور جس کا:

بستہ با امروز او فرداش نیست
حلقہ ہاے روز و شب در پاش نیست

چشم ہستی را مثال مردم ست
غیر را بینندہ و از خود گم ست

رفتہ رفتہ:

صد گرہ از رشتہ خود وا کند
تا سر تار خودی پیدا کند

گرم چوں افتد بکار روزگار
ایں شعور تازہ گردد پایدار

نقشہا بردار و اندازد او
سرگذشت خویش رامی سازد او

اسی طور پر:

قوم روشن از سواد سرگذشت
خود شناس آمد زیادِ سرگذشت

سرگذشت او گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود

چشم پرکارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفسہاے رمیدہ زندہ شو

سر زند از ماضیِ تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو

مشکن از خواہی حیات لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موج ادراک تسلسل زندگی است
می کشاں را شور قلقل زندگی است

موجودہ زمانہ میں ہر حقیقت کی سند جواز یا عدم جواز یورپ سے حاصل کی جاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یورپ کے اصول یا اس کے فیصلے نقائص یا غلطیوں سے مبرا ہوتے ہیں۔ بلکہ آج وہ فاتح کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے حواریین کو ممتاز اور مخالفین کو سرنگوں کرنے کے قابل ہے، ہم آج یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا خوبیاں ہیں بلکہ یورپ کے بعض صریح نقائص کو بھی چاہتے ہیں کسی طور پر مستحسن ثابت کر سکیں قطع نظر دیگر

مسائل کے جن کو معرض بحث میں لانا طوالت سے خالی نہیں ہے۔ ایک مسئلہ خواتین کی تعلیم حقوق اور آزادی کا ہے، یہاں اس سے بحث نہیں کہ یورپ نے عورتوں کو کیا سمجھ یا بنا رکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کا جو درجہ مقرر کیا ہے وہ ہماری نظروں میں کیا وقعت رکھتا ہے۔ تعدادِ ازدواج، پردہ اور اس قسم کی اور چیزیں ہم روشن خیالوں کے لیے نہایت روح فرسا ہیں اور مغرب کے لیے جب ''حلف وفاداری'' اٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر عورت ہی پر پڑتی ہے اس کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اگر مذہب بھی زد میں آجائے۔ نام نہاد روشن خیال طبقہ کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے یا ان کی میلانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ان میں سے ہر ایک کی نظر صرف دو نقائص پر پڑتی ہے، ایک مذہب دوسری عورت۔ لیکن لطف، عبرت یا تعجب یہ ہے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو مشرق بالخصوص اسلام کے امتیازات خصوصی ہیں، اسلام نے عورت (بالفاظ دیگر امومت) کو کیا درجہ دیا ہے۔ اقبال کے حسب ذیل خیالات سے ظاہر ہوگا:

پوشش عریانی مرداں زن ست
حسن دل جو عشق را پیراہن ست

آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود باطیب و صلوٰۃ

ملت از تکریم ارحام ست و بس
ورنہ کار زندگی خام ست و بس

بردمد ایں لالہ زار ممکنات
از خیابان ریاض امہات

حافظ رمز اخوت مادراں
قوت قرآن و ملت مادراں

اقبال نے نساءِ اسلام کے لیے سیدۃ النساءؓ کو ''اسوہ کاملہ'' قرار دیا ہے:

نور چشم رحمتہ للعالمین
آں امام اولین و آخریں

بانوے آں تاجدار ھل اتی

مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا

مادر آں مرکز پر کار عشق
مادر آں کارواں سالار عشق

مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں و لب قرآں سرا

مثنوی کے اس حصے کو اقبال نے انتہائے جوش عقیدت سے لکھا ہے جس کے ایک ایک حرف سے والہانہ شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے موجودہ زمانہ میں تہذیب و شائستگی کے نام سے پیکر ناموس وعفت کے ساتھ جیسا کچھ سلوک روا رکھا جا رہا ہے، اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

اے ردایت پردۂ ناموس ما
تاب تو سرمایہ فانوس ما

اے امین نعمت آئین حق
در نفسہائے تو سوز دین حق

دور حاضر تر فروش و پرفن ست
کاروانش نقد دیں را رہزن ست

کور و یزداں ناشناس ادراک او
ناکساں زنجیری پیچاک او

چشم او بیباک و نا پرواستے
پنجۂ مژگان او گیراستے

ہوشیار از دست برد روزگار
گیر فرزندان خود را درکنار

این چمن زاداں کہ پرنکشادہ اند
ز آشیان خویش دور افتادہ اند

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہراؓ بلند

تا حسینؓ شاخ تو با آورد
موسم پیشیں بہ گلزار آورد

خاتمہ مثنوی پر اقبال نے سورۂ اخلاص (قل ھو اللّٰہ) کی تفسیر دی ہے اور اسے ''خلاصہ مطالب مثنوی'' قرار دیا ہے۔ ''ھو اللّٰہ احد'' کا پیغام حضرت صدیقؓ کے زبان مبارک سے یوں دیا ہے:

آں کہ نام تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوے یکی آوردہ است

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ
واے بر تو آنچہ بودی ماندۂ

صد ملل از ملتے انگیختی
بر حصار خود شبیخوں ریختی

یک شود توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن

اسی طور پر دیگر آیات شریفہ کی ترجمانی کی ہے:

گر بہ اللہ الصمد دل بستۂ
از حد اسباب بیروں جستۂ
بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردش دولاب نیست

راہ دشوارست ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی آزاد میر

خود بخود گردد در میخانہ باز
برتہی پیمانگان بے نیاز

فارغ از اب و ام و اعمام باش
ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

گر نسب را جزو ملت کردۂ
رخنہ درکار اخوت کردۂ

رشتۂ ما یک تولایش بس ست
چشم مارا کیف صہبایش ست

ہر کہ پادر بند اقلیم وجدست
بے خبر از لم یلد لم یولد ست

رشتۂ با لم یکن باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی

آں کہ ذاتش واحد ست و لاشریک
بندہ اش ہم در نہ ساز باشریک

مومن بالاے ہر بالا ترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی

آخر میں اقبال نے ''رحمۃ للعالمین'' کے حضور میں ''عرض حال'' کیا ہے:

اے ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
در جہاں شمع حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

مسلم از سر نبیؐ بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

از منات و لات و عزّیٰ و ہبل
ہر یکے دارد دبتے اندر بغل

اے کہ از احسان تو ناکس کس ست
یک دعایت مزد گفتارم بس ست

عرض کن پیشِ خداے عزوجل
عشق من گردد ہم آغوش عمل

ہست شان رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

تا بیاساید دل بے تاب من
بستگی پیدا کند سیماب من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز انجامم نگر

(آثار اقبال،مرتّبہ: غلام دستگیر،حیدرآباد دکن،۱۹۴۴ء)

علامہ اقبال کا فلسفۂ بیخودی

مولانا عبدالسلام ندوی

ڈاکٹر علامہ اقبال سے پہلے خودی اور بے خودی میں باہم کوئی ربط و علاقہ نہ تھا، اس لیے دونوں نامکمل تھے۔ نٹشے کے یہاں ''انفرادی خود اختیاری کا اس قدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے نہایت غیر معین اور غیر مبہم سا رہ جاتا ہے۔'' لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ خودی نہایت ناقص ہے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس کے برعکس صوفیا انفرادی خودی کو خدا کی ذات میں بالکل فنا کر دینے کی تعلیم دیتے تھے اور اس غرض سے وہ انفرادی خودی کو قطرہ سے اور خدا کو دریا سے تشبیہ دیتے تھے، جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح قطرہ دریا سے مل کر بالکل فنا ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کو اپنی خودی خدا کی ذات میں فنا کر دینی چاہیے لیکن ڈاکٹر صاحب اس کی مخالفت کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر قطرہ دریا میں جا کر موتی نہ بنا اور بالکل فنا تو یہ سراسر اس کا نقصان ہے کہ اپنی گرہ کا مال بھی گیا اور کچھ حاصل بھی نہ ہوا:

ز خود گذشتۂ اے قطرۂ محال اندیش　　شدن بہ بحر و گہر بر نخاستن تنگ است

اس لیے وہ قطرہ کو ایک دریا میں جانے کی تعلیم دیتے ہیں جس میں ابھرنے اور ڈوبنے دونوں حالتوں میں خودی اور بھی نمایاں ہوتی ہے:

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر　　کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر　　مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

لیکن یہ دریا خدا کی ذات نہیں جیسا کہ صوفیا کا خیال ہے بلکہ قوم و ملت کا وجود ہے اور اسی دریا میں ڈوب کر افراد انسانی دریا کے اندرونی خزانہ سے مالا مال ہو سکتے ہیں:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر　　ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص　　کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

اس بحر بیکنار میں ڈوب پر جب افراد اپنی خودی کا بالکل فنا کر دیتے ہیں تو وہ گوہرِ مقصود ہاتھ آ جاتا ہے جس کو قومی خودی کہتے ہیں:

مسلمانی غم دل در خریدن　　چو سیماب از تپ یاراں تپیدن
حضورِ ملت از خود در گذشتن　　دگر بانگِ انا الملت کشیدن

اسی بنا پر ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ:

خودی از بے خودی آید پدیدار

اور اب یہ قومی خودی اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ خدائی کا دعویٰ بھی اس کے لیے جائز ہو جاتا ہے:

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست　　سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ　　اگر قومے بگوید ناروا نیست

اسی بے خودی یا فردِ ملت کے باہمی ربط کو ڈاکٹر صاحب نے مختلف شاعرانہ تمثیلات سے سمجھایا ہے مثلاً:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ　　ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے　　کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور　　خالی ہے جیبِ گُلِ زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور　　رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو　　نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ　　پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے　　کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے
محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی　　عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی
اے شب کے پاسبانو! آے آسماں کے تارو!　　تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے　　رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں　　شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمھاری

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے　　وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

حسنِ ازل سے پیدا تاروں بھری فضا سے　　جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا　　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیزگام ایسا　　　قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم　　　داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے　　　جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے　　　پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

فرد تا اندر جماعت گم شود　　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
برگ سبزے کز نہالِ خویش ریخت　　　از بہاراں تارِ امیدش شکست
مردمان خوگر بیک دیگر شوند　　　سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
محفلِ انجم ز جذبِ باہم است　　　ہستیِ کوکب ز کوکب محکم است

انفرادی حالت میں خودی بالکل خودمختار، مطلق العنان اور سراپا غرور ہوتی ہے لیکن جماعت میں شامل ہوکر یہ تمام اخلاقِ رذیلہ بدل جاتے ہیں اور ان کے بجائے باہمی لطف ومحبت کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے:

جبر قطعِ اختیارش میکند　　　از محبت مایۂ دارش میکند
ناز تا ناز است کم خیزد نیاز　　　ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز
در جماعت خود شکن گردد خودی　　　تاز گلبرگے چمن گردد خودی

لیکن سوال یہ ہے کہ فرد و جماعت کے باہمی ربط کا وہ اصول جس سے عداوت کے بجائے محبت اور ناز کے بجائے نیاز پیدا ہو، کیا ہے؟ یورپ نے اس کے متعلق جو اصول قائم کیے تھے، وہ سب کے سب سیاسی، معاشی اور وطنی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے ان سے محبت کے بجائے عداوت اور نیاز پیدا ہوتا تھا۔ انقلابِ فرانس جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں شروع ہوا تھا، فرد کی آزادی کا علمبردار تھا، لیکن جب مشینی ترقی کے سیلاب نے دولت اور ذخائر دولت کو چند افراد کی ملکیت بنانا شروع کیا اور سرمایہ داروں نے شہنشاہیت کے ساتھ ساز باز کر کے پوری دنیا کو چند افراد کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تو فرد کی آزادی کے خلاف بغاوت شروع ہوئی اور اس بغاوت نے ایک طرف تو مارکس کی بین الاقوامی اشتراکیت کو پیدا کیا اور دوسری طرف میکیاولی کے قومی اتحاد کے تصور کو رفتہ رفتہ جرمنی کی قومی اشتراکیت (نیشنل سوشلزم) اور اٹلی کی فسطائیت (فاشزم) کے روپ میں جلوہ گر کیا، جس کا فرد کو جماعت پر قربان کر دینا سب سے پہلا اصول ہے۔

غرض جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا دماغ غور وفکر کے مراحل طے کر رہا تھا، یورپ میں فرد وملت

کی بحثیں شروع ہوگئی تھیں۔ اگر چہ اس مسئلہ کے متعلق اب تک مفکرین مختلف الرائے ہیں، تاہم اتنا طے ہو چکا ہے کہ فرد کو شترِ بے مہار کی طرح بالکل آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا، لیکن جہاں فسطائیت و اشتراکیت میں فرد کی آزادی کو بالکل نظر انداز کر دینے پر اصرار کیا جاتا ہے وہاں جمہوریت میں فرد و ملت کی آزادیوں کے درمیاں ایک قسم کی مفاہمت کرانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن بہر حال یہ تمام اصول سیاسی، معاشی اور وطنی ہیں اور دنیا میں اس وقت جو قیامت خیز ہنگامے برپا ہیں، ان سب کو انھی اصولوں نے پیدا کیا ہے اور اس بنا پر پیدا کیا ہے کہ ان کی بنیاد مادیت پر ہے، روحانیت پر نہیں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفۂ بےخودی کی بنیاد روحانیت پر رکھ کر ان تمام جھگڑوں کو ختم کرنا چاہا ہے اور یہی وہ اصولی فرق ہے جو ان کے فلسفۂ فرد و ملت کو یورپ کی جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور قومی اشتراکیت جیسے فلسفوں سے بالکل علیحدہ کر دیتا ہے اور افراد کا یہ روحانی ربط ایک ایسی ملت پیدا کر دیتا ہے جس کے حدود قوم و نسل رنگ و نسب یا وطن و مرز بوم کی رائج الوقت اصطلاحوں سے متعین نہیں ہوتے بلکہ روحانی افکار و خیالات سے اس کی حد بندی ہوتی ہے۔ اس لیے اجتماعیت اور انفرادیت کی جو کشمکش دولت و ذخائر دولت کے محدود ہونے کی وجہ سے یورپ میں نظر آتی ہے، وہ ان کے فلسفہ میں نابود ہے۔

(عبدالسلام ندوی— اقبال کامل)

❁...❁...❁

مقدمہ شرح رموزِ بیخودی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مثنوی رموزِ بیخودی جب ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ تو اس کے ساتھ حضرت علامہ نے ایک مختصر سا دیباچہ بھی شامل کر دیا تھا۔ جسے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا تھا۔ چونکہ اس میں علامہ نے اس مثنوی کے مقاصد کی تشریح کی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اسی کو درج کرتا ہوں:

یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے جس طرح حیاتِ افراد میں جلبِ منفعت، دفعِ مضرت، تعیینِ عمل و ذوق، حقائق عالیہ، احساس نفس کے تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔[1]

افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اُس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔

علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدِ نظر رکھ کر مَیں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص[2] الہیّت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اُس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اُصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آ چکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔[3]

مثنوی کے مباحث پر ایک نظر

اس مثنوی کا مقصد تو علامہ کے ارشادات سے بالکل واضح ہو گیا، چنانچہ اس پر مزید حاشیہ آرائی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے مباحث پر اجمالی تبصرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اس مثنوی کے مباحث عالیہ پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ علامہ نے اس میں اسلام کے دستور العمل کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی اس کے مطالعہ سے ہر شخص اسلام کے بنیادی افکار، اُصول اور ارکان سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اور جو نقش اس کے مطالعہ سے دماغ میں قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دینِ اسلام بلاشبہ ایک مخصوص ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کا نام ہے، اس لیے وہ دنیا کے کسی نظام حیات یا دستور العمل سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اسلامی دستور العمل ایک عضوی کل کا حکم رکھتا ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کر کے ملتِ اسلامیہ میں شامل رہ سکے۔ اس دستور العمل کے اُصول اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر ایک اصل کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جس طرح مشین کا ایک پرزہ اگر اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو پوری مشین بیکار ہو جائے گی۔ مثلاً

(۱) اگر آپ ختمِ نبوت کے عقیدہ سے دستبردار ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ کہ میں آخری کتاب ہوں باطل ہو جائے گا۔

(۲) اگر آپ مساوات کے عقیدہ کا انکار کر دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے اسود اور احمر، سرمایہ دار اور مزدور کے امتیاز کو اسلامی نظام میں داخل کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" کی تعلیم باطل ہو جائے گی۔

(۳) اگر آپ سود کو جائز کر دیں تو قرآن کا تمام معاشی نظام زیر و زبر ہو جائے گا۔

(۴) اگر آپ ملوکیت کو تسلیم کر لیں تو توحیدِ الٰہی کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔

(۵) اگر آپ یہ تسلی کر لیں کہ صداقت، قرآنِ حکیم سے باہر بھی پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے تو تبلیغ و اشاعت اسلام کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی حیات کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

(۶) اگر آپ سیاست کو دین سے جدا کر دیں تو دین کی حیثیت سے اسلام بالکل ختم ہو جائے گا، محض پوجا پاٹ کا نام رہ جائے گا۔

(۷) اگر آپ زندگی کے کسی ایک شعبے میں بھی دنیا کے کسی آدمی کو اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو آنحضرتؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ ان چند مثالوں سے میرا مطلب ناظرین پر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلام کا ایک کامل اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ میرے علاوہ تمام نظام باطل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ اعلان فرما دیا ہے:

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ۔ (۹:۳۳)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تا کہ وہ اس کو تمام ادیان عالم پر غالب کر دے، اگر چہ یہ فعل مشرکوں کو تو ضرور نا گوار گزرے گا۔

اس آیت سے، جو اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے کسی تفسیر کی محتاج نہیں ہے، یہ بات بالکل روشن ہے کہ دینِ اسلام ساری دنیا کے خلاف چیلنج یا الٹی میٹم ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اس دین (دستور العمل) کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کرے اور چونکہ یہ کام صرف اسی صورت سے وقوع پذیر ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان مل کر اظہارِ دین کے لیے جدو جہد کریں اس لیے ہر مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی بسر کرنا سیکھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمائی کہ ''لا اسلام الا بالجماعة''، یعنی جماعت سے علیحدہ رہ کر کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور اقبال دونوں کی یہ تعلیم قرآن حکیم کی اس آیت سے مقتبس ہے:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا۔ (۳:۱۰۳)

اے مسلمانو! سب مل کر اللہ کی رسی (قرآنِ حکیم) کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ اور اپنے آپ کو مختلف فرقوں میں تقسیم مت کرو۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ جب تک سارے مسلمان قرآنِ حکیم پر جمع نہیں ہوں گے، وہ اس کی نشر و اشاعت کے لیے کوئی متحدہ کوشش نہیں کر سکتے اور جب متحدہ کوشش نہیں ہو گی تو قرآنِ حکیم، ادیانِ عالم پر غالب کیسے آ سکتا ہے؟ چونکہ آج ہم مسلمان مختلف فرقوں میں منقسم ہو چکے ہیں، اس لیے قرآنِ حکیم کو دنیا میں شائع کرنے کے لیے نہ کوئی جماعت کوشش کر رہی ہے نہ کوئی حکومت، نہ کوئی مملکت۔ کیا یہ انتہائی افسوس کا مقام نہیں ہے کہ سعودی حکومت نے بھی قرآنِ حکیم کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی!

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رموزِ بیخودی میں اقبال نے قرآنِ حکیم کی اسی آیت شریفہ کی تفسیر کی ہے کہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

(۲)　آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ آپؐ (اور آپؐ کے متبعین) اس دین (دستور العمل) کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دیں۔ یعنی تمام باطل ادیان کو دنیا سے مٹا دیں۔ تاکہ ساری دنیا دینِ حقّہ (اسلام) کی پیرو (مطیع) بن جائے اور ساری دنیا میں ایک ہی دستور العمل نافذ ہو جائے جس کا نام اسلام ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ (۳:۱۹)

یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف اسلام ہی سچا دین (دستورِ حیات) ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ مسلمان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے پسندیدہ دین (دستور العمل) کو دنیا میں نافذ کر دیں۔

(ا)　یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب دوسرے ادیان مٹ جائیں۔

(ب) اور یہ اسی صورت سے ممکن ہے کہ سارے مسلمان مل کر دینِ اسلام کے غلبہ کے لیے جدو جہد کریں۔

(ج) اور متحدہ کوشش اسی وقت ہو سکتی ہے جب سارے مسلمان قرآنِ حکیم کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں۔ یعنی قرآنِ حکیم پر جمع ہو جائیں۔

اس تصریح کے بعد اب ہم مثنوی کے مطالب کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:

علامہ نے اس مثنوی کو کسی شخص سے منسوب کرنے کی بجائے ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ موجودہ صدی میں کسی مسلمان نے اس سے بہتر ہدیہ اپنی قوم کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔ تمہید میں علامہ مرحوم نے فرد و ملت کے ربط باہمی کو واضح کیا ہے۔ تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ پہلے باب میں اُنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ملت (قوم) افراد کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے باب میں اُنھوں نے ملتِ اسلامیہ کے بنیادی ارکان میں سے پہلے رکن "توحید" کا بیان کیا ہے۔

تیسرے باب میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ عقیدۂ توحید، یاس و حزن و خوف اور دوسرے رُوحانی امراض کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اور اس نکتہ کو تیر و شمشیر اور حضرت عالمگیرؒ کی حکایت سے واضح کیا ہے۔

چوتھے باب میں اسلام کے دوسرے بنیادی رکن "رسالت" کی توضیح کی ہے۔

پانچویں باب میں یہ بتایا ہے کہ رسالتِ محمدیہؐ کی غایت یہ ہے کہ بنی آدم کو حریت، اخوت اور مساوات (اُصول سہ گانہ) کی دولت نصیب ہو جائے، اور ان اُصول سہ گانہ کا مفہوم تین تاریخی حکایات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔

چھٹے باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ملتِ محمدیہؐ چونکہ توحید اور رسالت پر مبنی ہے۔ اس لیے کسی خاص ملک سے وابستہ نہیں ہے۔ اس نکتہ کو اُنھوں نے جداگانہ باب میں واضح کیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کی

قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ توحید ہے۔

ساتویں باب میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ جس طرح اُمتِ محمدیہؐ مختص بالمکان نہیں ہے۔ اسی طرح مختص بالزمان بھی نہیں ہے۔ یعنی یہ ملت شریفہ قیامت تک باقی رہے گی۔

آٹھویں باب میں یہ بیان کیا ہے کہ قانون کے بغیر کسی قوم کا نظام صورت پذیر نہیں ہوسکتا، اور ملتِ محمدیہؐ کا قانون (ضابطۂ حیات) قرآن ہے۔

نویں باب میں یہ بتایا ہے کہ جب قوم کے اندر ذہنی اور عقلی اعتبار سے انحطاط رُونما ہو جائے تو اجتہاد کی بجائے تقلید زیادہ مناسب حال ہوتی ہے۔

دسویں باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قومی سیرت کی پختگی صرف شریعتِ الٰہیّہ کی پابندی سے ہوسکتی ہے۔

گیارہوں باب میں اس راز کو فاش کیا ہے کہ قومی سیرت میں دلکشی محض اتباعِ رسولؐ سے پیدا ہوسکتی ہے۔

بارہویں باب میں یہ بات بیان کی ہے کہ قومی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مرکز محسوس کرنے کی ضرورت ہے اور وہ مرکز بیت الحرام ہے۔

تیرہواں باب اس ساری کتاب کی جان ہے اور اس میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ حقیقی جمعیت اس وقت پیدا ہوسکتی ہے کہ قوم کا ہر فرد ملی نصب العین کے حصول میں منہمک ہو جائے اور امتِ محمدیہؐ کا نصب العین توحید الٰہی کی حفاظت اور اشاعت ہے۔

چودہویں باب میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی قوم، نظامِ عالم کی قوتوں کو مسخر کر لے تو اُس کی قومی زندگی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

پندرہویں باب میں اس نکتہ کی صراحت کی ہے کہ حیاتِ ملی کا کمال یہ ہے کہ فرد کی طرح ملت میں بھی خودی کا احساس پیدا ہو جائے اور یہ احساس، ملی روایات کی حفاظت اور ان پر عامل ہونے سے پیدا ہوسکتا ہے۔

سولہویں باب میں یہ بات بیان کی ہے کہ نوعِ انسانی کی بقا عورت کی ماں ہونے کی حیثیت پر موقوف ہے۔ لہٰذا عورتوں اور خاص طور سے ماؤں کا احترام اسلام کی بنیاد ہے۔

سترہویں باب میں اُنھوں نے یہ بتایا ہے کہ سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ مسلمان عورتوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔

اٹھارہویں باب میں اقبال نے مسلمان عورتوں سے خطاب کیا ہے اور ان کو اسوۂ بتولؓ پر عامل ہونے کی تلقین کی ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے مثنوی کے مطالب کو سورۂ اخلاص کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے اور اس

میں شک نہیں کہ اس باب میں اُنھوں نے بہت ندرتِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی آیتوں کا مطلب بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ یہی رنگ اپنے اندر پیدا کرو۔

آخر میں اُنھوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں پہلے اپنا حال دل بیان کیا ہے۔ اس کے بعد یہ درخواست کی ہے:

ہست شانِ رحمت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

رموزِ بیخودی میں حضرت اقبال نے دنیا کو اس دستورِ حیات کے بنیادی اُصول سے آگاہ کیا ہے جسے قرآن کریم نے دینِ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ دین بلا شبہ ادیان عالم میں عدیم المثال اور فقید النظیر ہے، لیکن اس دین کے پیرو بارہ سو سال سے اس کے پیش کردہ آئین سے بکلی منحرف ہو چکے ہیں اور گزشتہ تین چار سو سال سے تو یہ حالات ہے کہ اسلام وہ اسم ہے جس کا مسمیٰ خارج میں کہیں موجود نہیں[۴] ہے، اس لیے اس کی بنیادی خصوصیات ایک ایک کر کے پردۂ خفا میں مستور ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی آئین کو خوبی صرف اس آئین پر عمل کرنے ہی کی بدولت اہلِ عالم پر آشکار ہو سکتی ہے۔

دراصل دینِ اسلام، جملہ ادیان و مذاہب عالم اور انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے تمام ضابطوں کے خلاف ایک زبردست چیلنج ہے، یعنی دعوتِ مبارزت ہے۔

چنانچہ قرآنِ حکیم کی آیت میرے دعویٰ پر شاہد ہے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ (۸۱:۱۷)

اور آپؐ اعلان کر دیجیے کہ "الحق" آ گیا (اس کے آنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ باطل مٹ جائے گا۔ بالفاظ دیگر باطل کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اس لیے قرآنِ حکیم نے ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا) اور مٹ گیا۔ "الباطل" بلا شک باطل کی ذات میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مٹ جانے والا ہے یعنی حق کے مقابلہ میں اُسے کبھی ثبات و دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اس کے اقتضائے ذات کے خلاف ہے۔ میں نے یہ مفہوم عارف علوم ربّانی دانائے حقائقِ قرآنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مجدد دہلوی کے ترجمہ سے اخذ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وبگوئید آمد دینِ حق و نابود شد دینِ باطل۔ ہر آئینہ باطل است نابود شوندہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے الحق کا ترجمہ دینِ حق کیا ہے اور دینِ حق صرف قرآنِ حکیم کے اندر محصور ہے۔ اس کے باہر کہیں دینِ حق نہیں ہے اور الباطل کا ترجمہ دینِ باطل کیا ہے یعنی دنیا کے تمام ادیانِ باطلہ۔ الحق کا مطلب یہ ہے کہ صرف قرآن ہی حق ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، سب باطل ہے۔[۵]

اس آیت شریفہ سے ثابت ہو گیا کہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ صداقت، ہدایت اور حق قرآنِ حکیم کے علاوہ اور کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دگر دینِ اسلام کے علاوہ اور تمام ادیان و مذاہب عالم باطل ہیں۔ اور یہی مطلب ہے قرآن حکیم کی ان آیتوں کا:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ۔ (۳:۱۹)

بلاشبہ خدا کے نزدیک دینِ معتبر صرف اسلام ہی ہے۔

وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَ ہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَo (۳:۸۵)

اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی طلب کرے گا۔ وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اُس سے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ اسلام کے علاوہ اور کوئی دین، اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالیہ میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ دینِ اسلام اس وقت قرآنِ عزیز کے علاوہ اور کسی کتاب میں محفوظ نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مقدس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَo (۱۵:۹)

بے شک ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دینِ اسلام صاف اور صریح لفظوں میں یہ اعلان کرتا ہے کہ صداقت اور ہدایت اس وقت قرآن کے علاوہ اور کہیں موجود نہیں ہے۔ کسی مذہب میں نہیں ہے۔ کسی نظامِ اخلاق میں نہیں ہے اور کسی ہیئتِ اجتماعیہ میں نہیں ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔ کہ کیا دوسرے لفظوں میں یہ ساری دنیا کو چیلنج نہیں ہے؟

دینِ اسلام کی تمام خصوصیات کی تفصیل تو اس تمہید میں ناممکن ہے۔ اس لیے صرف ایک خصوصیت کے بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ دنیا میں جس قدر مذاہب ہیں وہ سب انسان کی اخروی نجات کا بندو بست کرنے کے مدعی ہیں، دنیاوی زندگی کے لیے کوئی ضابطہ یا دستور العمل پیش نہیں کرتے۔ لیکن دینِ اسلام ایک مکمل دستورِ حیات ہے یعنی وہ ایک اخلاقی نصب العین بھی ہے اور ایک نظام سیاست و معاشرت بھی ہے چنانچہ فرد اور جماعت کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کی گرفت میں آزاد نہیں ہے اور جہاں تک بنیادی اُصول کا تعلق ہے، اسلام کسی نظام سے مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام مذہبوں اور اخلاقی نظاموں کو مٹا کر اپنا قانون نافذ کرنا چاہتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان زندگی کے کسی شعبہ میں بھی کسی دوسرے شخص کی رہنمائی قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی وفاداری کا آخری مرجع صرف قرآنِ حکیم اور سنتِ رسولؐ ہے۔

چونکہ دینِ اسلام زندگی کا ایک مکمل ضابطہ ہے اس لیے وہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے انسان ایک سلک میں منسلک ہو جائیں اس مقصد کے لیے اس نے ایسا حیرت انگیز ضابطہ نافذ کیا ہے کہ دنیا کے کسی قدیم یا جدید مذہب یا نظامِ فکر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یعنی اس نے ساری دنیا کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(ا)　جو لوگ سرکارِ مدینہ ﷺ کی غلامی اختیار کر لیں وہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہیں۔ خواہ وہ کالے ہو یا گورے اور چینی ہوں یا جاپانی۔

(ب)　جو لوگ حضورِ انور ﷺ کی غلامی سے انکار کریں وہ سب ملتِ کفر کے افراد قرار دیے جائیں گے۔ الکفر ملة واحدة یعنی دینِ اسلام کی رو سے مسلمانِ عالم کی بنیاد، نہ وطن ہے نہ رنگ نہ نسب ہے نہ زبان، بلکہ عقیدۂ توحید ہے۔ چونکہ یہ تعلیم دینِ اسلام کو تمام مذاہبِ عالم سے متمیز کر دیتی ہے۔ اور نظریہ قومیت و وطنیت اسلام کے بنیادی اُصول کی بیخکنی کر دیتا ہے۔ اس لیے علامہ اقبال نے ۱۹۰۴ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک یعنی ساری عمر اس غیر اسلامی نظریہ کے خلاف جہاد کیا۔ چنانچہ ارمغان میں لکھتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذاں من　　　از و آموختم اسرار جاں من
بدورِ فتنۂ عصر کہن او　　　بدورِ فتنۂ عصر رواں من

رموزِ بیخودی کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ اسلام، دیگر مذاہب کی طرح محض پوجا پاٹ کا نام نہیں ہے یا فرد کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نام ہے۔ اس لیے کوئی مسلمان ملت سے جدا ہو کر اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اور جب یہ ممکن نہیں تو وہ اپنی خودی کو بھی مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچا سکتا۔

اب میں خود علامہ کی تحریروں سے اس نکتہ کو واضح کرتا ہوں۔ تا کہ ناظرین کے دلوں پر اس کی اہمیت نقش ہو جائے۔

جس طرح نوعِ انسان کی مجموعی ترقی کے لیے مختلف اقوام کا نیست و نابود ہو جانا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ کسی قوم کے ارتقا کے لیے کئی افراد نذرِ اجل ہو جائیں یا قوم کے نشوونما کی خاطر ان کے ذاتی حقوق کی پرواہ نہ کی جائے۔ لیکن یہاں ایک عجیب اور مشکل سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ ہے کہ جس صورت میں کسی خاص فرد کو قوم کی آئندہ نسلوں کی بہبودی، ان کی عظمت و جلال اور ان کی عقلی اور تمدنی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تو کیوں اس کے ذاتی حقوق پر قومی ارتقا کو ترجیح دی جائے؟ کیا میں آج سے سو سال کے بعد زندہ ہوں گا؟ اگر نہیں تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے آپ کو قوم کے لیے قرباں کر دوں؟ اور اپنی نیند حرام کر کے قوم کی آئندہ بہبودی کے لیے بے خواب راتیں بسر کروں؟ اگر چہ اس سوال کا کوئی عقلی

جواب ہمارے پاس نہیں ہے لیکن اس خطرناک شبہ کے وقت مذہب ہماری دستگیری کرتا ہے۔ اور ہمیں بتاتا ہے کہ ایثار یعنی اوروں کے نفع کو اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھنے کی بنا پر عقل نہیں ہے۔ بلکہ یہ نیکی جو ارتقا نوعِ انسانی وقومی کے لیے بہت ضروری ہے، ایک فوق العادت اُصول پر مبنی ہے۔ آوازِ نبوت کا اصلی زور اور اس کی حقیقی وقعت عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دارو مدار اس روحانی مشاہدہ پر ہے جو نبی کی غیر معمولی قوتوں کو حاصل ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کی آواز میں وہ ربّانی سطوت اور جبروت پیدا ہو جاتا ہے۔ (ماخوذ از رسالہ مخزن بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء)

مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصلی اُصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن اور نہ اشتراک اغراض اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں، وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تمام مادّی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے، اور اس کی قومیت کا دارو مدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے، جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے، جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا، اس کی پولیٹیکل نشو ونما میں بہت بڑا حصہ لیا۔ لیکن اسلامی علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے سرانجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کی جولا نگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے۔ لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسی اُصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے؟ (ماخوذ از ملتِ بیضا پر عمرانی نظر)

اسلام کی حقیقت ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم اُصولِ اسلام سے پُوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی وطن ہے، جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہی نسبت اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اُصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں ''خدا کی رسی'' ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر نظر نہیں ڈال کر اغیار کے تمدن کو بلا مشارکتِ احدے اپنا

ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ اور یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبرالہ آبادی سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا۔ چنانچہ وہ نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظرِ غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پُکار اُٹھتے ہیں:

شیخِ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخِ مرحوم کنا یہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اُس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تہذیب و تعلیم کے بارے میں سرسیّد احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر پڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ ''شیخ مرحوم'' کے قول میں جو صداقت مضمر ہے، اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنجیدہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب العلم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نا بلد ہے۔ روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے۔ اور اگر موجودہ صورت حالات بیس سال تک[٦] قائم رہی تو وہ اسلام رُوح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برادروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل اُصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے۔ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی راہیئت اور نوعیت سے بہت زیادہ باخبر تھے۔

خودی اور بےخودی میں نسبتِ باہمی

بعض لوگ قلتِ تدبر کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ خودی اور بےخودی میں تباین یا تضاد کی نسبت ہے۔ اس غلطی کا مبنیٰ یہ ہے کہ فارسی زبان میں لفظ ''بے'' سے نفی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً ہوشیار سے ہوش کر نفی کرنے کے لیے بے ہوش اور زردار سے زر کی نفی کے لیے بے زر کی ترکیب مستعمل ہے۔ لیکن یہاں بےخودی سے خودی کی نفی مراد نہیں ہے، اس لیے ان لفظوں میں تباین یا تضاد کی نسبت نہیں ہے۔ یعنی بےخودی، خودی کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں لفظوں میں عدم و ملکہ کی نسبت ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱)　دو چیزوں میں جو نسبتیں قائم کی جاتی ہیں وہ دو اعتبار سے کی جاتی ہیں۔

(اُ)　یا تو صدق وحمل کے اعتبار مثلاً نسبت تباین یا تساوی یا عموم وخصوص۔

(ب)　یا وجود کے اعتبار سے مثلاً تضاد یا تضایف یا عدم وملکہ۔

نوٹ:　جن چیزوں میں تساویٰ یا عموم وخصوص کی نسبت ہوتی ہے، ان میں تضاد یا تضایف کی نسبت قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ ان میں اتحاد کلی یا اتحاد جزئی کی نسبت ہوتی ہے۔

(۲)　جب دو مفہوم ایسے ہوں کہ اُن دونوں کا ایک ہی حیثیت سے ایک زمانہ میں اور ایک محل میں اجتماع نہ ہو سکے، اوران دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے عدم پر مشتمل ہو، لفظاً یا معناً، تو ان میں ایجاب وسلب یا عدم وملکہ کی نسبت ہی متصور ہو سکتی ہے۔

جو ذات اس عدمی وصف کے ساتھ موصوف ہو اگر اُس میں وصفِ وجودی کے ساتھ موصوف ہونے کی صلاحیت ہے تو عدم وملکہ کی نسبت ہے۔ اور اگر یہ صلاحیت نہ ہو تو ایجاب وسلب کی نسبت ہے۔

(۳)　خودی ایک مفہوم وجودی ہے اور بے خودی اسی خودی کے عدم پر مشتمل ہے، اور جو ذات، بے خودی کے وصف کے ساتھ موصوف مانی جائے وہ وہی ہو سکتی ہے جس میں خود کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت موجود ہو کیونکہ جو خودی کا موصوف نہیں بن سکتا، اس کو ہم بے خود بھی نہیں کہہ سکتے۔

(۴)　اس سے ظاہر ہوا کہ خودی اور بے خودی میں عدم وملکہ کا تقابل پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ ذات جو خودی کے ساتھ موصوف ہو۔ وہ کسی دوسری حیثیت سے بے خودی کا محل بن جائے۔ اسی طرح وہ ذات جو کسی اعتبار سے کسی بے خودی کے ساتھ متصف ہے وہ دوسرے اعتبار سے محلِ خودی ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حالات وازمنہ کے تغیر سے ایک ہی محل میں خودی اور بے خودی دونوں کیفیتیں یکے بادیگرے متوارد ہوتی رہیں۔ کیونکہ متقابلین کے لیے دو جہتوں سے مجتمع ہو جانا، یا مختلف حالات وازمنہ میں انکا متوارد ہو جانا عقلاً ناجائز نہیں ہے۔ مثلاً محبت اور عداوت اگرچہ صفات متقابلہ ہیں لیکن ایک ہی شخص میں ایک ہی وقت میں پائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً زید ایک ہی وقت میں رام سے محبت کر سکتا ہیا ور شام سے نفرت کر سکتا ہے۔

(۵)　اسی طرح خودی اور بے خودی یہ دونوں صفات ایک ہی شخص میں ایک ہی وقت میں پائی جا سکتی ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ خودی اور بے خودی میں تباین یا تضاد کی نسبت نہیں ہے بلکہ عدمِ وملکہ کی نسبت ہے یعنی ایک شخص خودی کی منزل میں رہتے ہوئے بے خودی کی منزل میں بھی آ سکتا ہے۔

(شرح رموزِ بیخودی از یوسف سلیم چشتی)

حواشی وحوالہ جات

۱-　تباین اور تناقض دونوں منطقی اصطلاحیں ہیں ان کا مثالوں سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

(ا)　انسان اور درخت میں تباین کی نسبت اور

(ب)　انسان پر اور لا انسان میں تناقض کی نسبت پائی جاتی ہے۔

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حدود کے مقرر ہو جانے سے افراد کے اعمال میں بڑی حد تک یگانگت اور یکسانیت پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ جن افراد کی منزل مقصود ایک ہوتی ہے ان میں وحدتِ کردار کا پایا جانا یقینی ہوتا ہے۔

۲- اس لفظ سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اجتماعی زندگی کے لیے جو دستور العمل عطا فرمایا ہے اس کی نظیر اقوام عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ مثلاً دنیا کی تمام قوموں نے اپنی قومیت کی بنیاد، وطن، نسب، رنگ یا نسل پر رکھی ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے عقیدۂ توحید کو ملتِ اسلامیہ کی قومیت کی بنیاد قرار دیا ہوا اور اسی نکتہ کو علامہ نے یوں بیان کیا ہو۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
(بانگِ درا)

۳- علامہ نے اس مثنوی کا تیسرا حصہ تو نہیں لکھا لیکن اس سوال کا تفصیلی جواب جاوید نامہ اور ضربِ کلیم میں ہدیہ ناظرین کر دیا ہے۔

۴- حضرت قدس مجدد الف ثانیؒ المتوفی ۱۰۳۴ھ نے اپنے مکتوبات میں کئی جگہ اس تلخ حقیقت کا اظہار فرمایا کہ ''اکنوں از اسلام بجز اسمے ہیچ شے باقی نماندہ است'' نیز حضرت مجدد دہلویؒ المتوفی ۱۱۷۶ھ نے ایک جگہ بایں الفاظ اپنے تاثرات بیان فرمائے کہ ''مسلماناں در گور، مسلمانی در کتاب'' واضح ہو کہ ہندوستان میں دینِ اسلام سے مسلمانوں کی برگشتگی کا سب سے بڑا سبب اکبر مرتد کا پیدا کردہ وہ فتنہ تھا جسے تاریخ میں ''دینِ الٰہی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جبھی تو اقبال نے یہ لکھا ہے:

تین سو سال ہیں ہند کے میخانے بند　　اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

۵- افسوس کہ اغیار کو خوش کرنے کے لیے صاحبِ ترجمان القرآن نے قرآنِ عزیز کی اس بنیادی تعلیم کو مداہنت کے غلاف میں پوشیدہ کر دیا۔ اور حق و باطل کو مخلوط کر کے ایک ایسے اسلام کی ترجمانی کی ہے جسے نہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور نہ کوئی غیر مسلم اُسے قبول کرنے کی طرف راغب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں موجود ہیں تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ کر بدیشی مذہب اختیار کرے؟

۶- علامہ مرحوم نے یہ اندیشہ ۱۹۱۲ء میں ظاہر کیا تھا، اور وہ صورتِ حالات چالیس سال سے بعینہٖ قائم ہے، لہٰذا ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ اس وقت ۱۹۵۲ء میں وہ ''اسلامی رُوح'' جس کی بقا کے لیے مرحوم نے ساری عمر جدوجہد کی ''ہماری جماعت'' میں کس حد تک باقی رہ گئی ہوگی۔ میرے خیال میں اسی صورتِ حالات کو دیکھ کر اکبر الہ آبادی نے یہ شعر لکھا تھا:

دین سے ملت سے یااللہ سے الفت ہوتی کیوں　　دودھ تھا ڈبہ کا اور تعلیم تھی سرکار کی

رموزِ بیخودی کے مباحث

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اقبال کی کتاب اسرارِ خودی کے بعض نظریات کو سطحی فہم رکھنے والے نقادوں نے نظرِ تحسین سے نہ دیکھا۔ روایتی تصوف کے دل دادگان کو اس سے جابجا ٹھوکر لگی۔ ہمارے ادب میں تو خودی ایک مذموم چیز تھی اور تصوف و اخلاق اس کو ابلیسانہ چیز سمجھتے تھے۔ فارسی اور اُردو ادب میں نفس انسانی کے ایزدی جوہر کے متعلق تو بہت کچھ ملتا ہے لیکن ہر جگہ تلقین یہی ہے کہ انسان اپنی خودی کو سوخت کر کے ہی اس جوہر کو اُجاگر کر سکتا ہے۔ خودی کی پرستش گناہ ہے اور خدا پرستی کے مخالف ہے:

تجھ کو خودی پسند ہے مجھ کو خدا پسند　　تیری جدا پسند ہے میری جدا پسند

اس تصور میں یہ 'انا' یا 'میں' یا 'ہم' پندار کا ایک بت ہے اور تمام بتوں کا قلع قمع کرنے کے بعد آخر میں یہی سنگ گراں معرفت میں سنگ راہ بن جاتا ہے:

گو لاکھ سبک دست ہوئے بت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

وحدت وجود کا فلسفہ، جو اسلامی شاعری اور تصوف کا مرکز و محور بن گیا، زیادہ تر خودی سوز ہی ہے۔ کیونہ اس کے اندر مخلوقات کی حیثیت محض ظلی ہے۔ اقبال نے روایتی تصوف کے خلاف جہاد اسرارِ خودی ہی سے کیا اور عمر کے آخری لمحوں تک یہ جہاد جاری رہا۔ مابہ النزاع خودی ہی کا مسئلہ تھا۔ اقبال خدا کو خودی میں جذب کرنے کی تلقین کرتا تھا اور تصوف خودی کو خدا میں گم کرنے کی تعلیم دیتا تھا۔ اسرارِ خودی سے بہت سے قارئین نے دھوکا کھایا اور سمجھا کہ یہ قوت اور تکبر کی تعلیم ہے اور اس میں انسان کی خودی کو خدا بنا دیا گیا ہے۔ اسرارِ خودی میں خدا کہیں نمایاں معلوم نہیں ہوتا، انسانی خودی وہاں خلاق بن گئی ہے۔ ان نقادوں کو یہ علم نہ تھا کہ اقبال اس سے اچھی طرح آشنا تھا کہ بے خودی بھی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ اگرچہ بے خودی کا مفہوم بھی اس کے نزدیک روایتی مفہوم سے بہت مختلف تھا۔ اقبال کے حکیمانہ اور دینی تصورات کا فقط ایک پہلو اسرارِ خودی میں پیش ہوا تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے دوسرے پہلو کو

پیش کرنا لازمی تھا۔ رموزِ بیخودی، اسرارِ خودی کا تکملہ ہے۔ اقبال کے نظریات حیات میں بحیثیت مجموعی ایک توازن موجود ہے۔ اگرچہ کلام کے بعض حصوں کو الگ الگ کر دیکھیں تو بعض اوقات فقط ایک پہلو کسی قدر شدت اور مبالغے کے ساتھ نظر کے سامنے آتا ہے۔

رموزِ بیخودی کی تمہید میں ربط فرد و ملت کے متعلق اقبال اپنا زاویہ نگاہ پیش کرتا ہے۔ یہ مسئلہ نفسیات 'اخلاقیات' سیاسیات اور معاشیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے متعلق اختلاف زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فرد کو ایک ایٹم سمجھ کر جو نفسیات لکھی گئی وہ حقیقت حیات سے بہت دور ہو گئی۔ سادہ اخلاقی تصورات بھی اس کے لیے نا قابل فہم ہو گئے اور سجوک جیسے اخلاقیات پر ضخیم تصنیف کرنے والے فلسفی آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں ایک فرد اپنی ذاتی مسرت کو دوسروں کے لیے قربان کرے۔ کانٹ کی اخلاقیات بھی آخر میں بے بنیاد ہو گئی اور اس نے اس عقیدے کا سہارا لیا کہ اگر تلافی کرنے والے خدا اور بعد الموت کا عقیدہ نہ ہو تو فرد کی فرض شناسی اور جماعت کے اغراض کے لیے اس کی ذاتی سعادت و مسرت کی قربانی کی کوئی عقلی تاسیس ممکن نہیں۔ جرمن فلسفی شٹیرنر اور نطشے کی طرح بعض حکماء نے فرد کو مطلق العنان کرنے کی تلقین کی تا کہ جماعت کے حدود و قیود اور اوامر و نواہی اس کی شخصیت کے بے روک ارتقاء میں خلل انداز نہ ہوں۔ دوسری طرف ہیگل جیسے فلاسفہ نے جماعت اور مملکت کو معبود بنا دیا اور فرد کی انفرادیت وہاں ایک بے حقیقت سا مظہر رہ گئی۔ اس کا اثر معاشیات و سیاسیات پر بہت گہرا پڑا۔ کارل مارکس نے اپنے فلسفے کا ڈھانچا ہیگل سے اخذ کیا اور اس کا عملی نتیجہ وہ اشتراکیت ہے جہاں فرد کی آزادی ضمیر اور آزادی عمل ایک گناہ کبیر ہے۔ مغرب میں حقوق طلبی کے جوش و خروش میں فرد نے جماعت کو اپنا حریف سمجھا، رفتہ رفتہ وہ مذہب سے بھی برگشتہ ہو گیا جو فرد کو جماعت کے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ تھا کشاکش افراط و تفریط کا نتیجہ تھی۔

اسلام اعتدال اور توازن کا نام ہے۔ ادیان میں فرد و ملت کے ربط کا مسئلہ عمدہ طور پر اسلام نے حل کیا تھا۔ اسلام فرد کے نفسیات کے کسی پہلو کو جماعت کے مفاد سے الگ نہیں کرتا۔ اس کی تمام عبادات میں اجتماعی عنصر بہت نمایاں ہے۔ نماز ہو یا روزہ، سب میں فرد جماعت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے باوجود اسلام نے بڑے زور و شور سے آزادی ضمیر کی تلقین کی اور کہا کہ دین، جس میں عقیدہ اور طریق زندگی شامل ہے، کسی جبر کو گوارا نہیں کرتا۔ جو چیز اختیار سے قبول نہیں کی گئی اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ رہبانی مذاہب میں اخلاق اور روحانیت افرادی رہ گئے تھے۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف فرد جو غار میں یا صحرا میں جماعت سے بے نیاز ہو کر خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

اقبال کے ہاں 'ربط فرد و ملت' کا نظریہ اسی اسلامی زاویہ نگاہ سے اخذ کردہ ہے۔ جماعت کے ساتھ

تمام نفسیاتی روابط کو ساقط کر کے نفس انسانی کی باقی ماندہ حقیقت کو دیکھیں تو وہ صفر رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے بہت پہلے کہا تھا کہ ''وجود افراد کا مجازی'' ہے یعنی فرد کی، جماعت سے ربط کے بغیر کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن جماعت کا یہ ہمہ گیر رابطہ انسان کی انفرادی خودی کو سوخت نہیں کرتا، بلکہ اس کی پرورش کرتا ہے۔ ہر شاخ اور ہر پتے کی اپنی بھی ایک مخصوص حیثیت ہے، لیکن شجر سے منقطع ہو کر نہ شاخ میں روئیدگی رہ سکتی ہے اور نہ پتا سرسبز رہ سکتا ہے:

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

تمام نوع انسان کی وحدت کی تعلیم قرآن میں موجود تھی کہ سب انسان ایک نفس واحدہ سے سرزد ہوئے ہیں۔ گویا تمام نوع انسان ایک جسم ہے اور مختلف افراد اس کے اعضا ہیں۔ اسی قرآنی تصور کو ان اشعار میں ادا کیا گیا ہے:

بنی آدم اعضاے یک دیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نہ ماند قرار

اگر کسی عضو میں ایسی انانیت پیدا ہو جائے کہ وہ دوسرے اعضا سے تعاون لا حاصل ایثار سمجھے تو خود وہ عضو معطل ہو جائے گا۔ یہ تمثیلی حکایت حکمت آموز ہے کہ انسانی جسم کے اعضا میں بے بصری سے ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ہم تو سب جدوجہد کرتے رہتے ہیں لیکن یہ پیٹ نکھٹو، ناکردہ کار ہماری محنت سے پیدا شدہ رزق کو اپنے اندر ڈال کر خود لطف اٹھاتا ہے۔ اس نکھٹو کا کامل مقاطعہ کرنا چاہیے۔ تمام اعضا نے رزق کی کوشش چھوڑ دی، پیٹ میں کچھ نہ گیا تو سب کی حالت زار و نزار ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ہم بے جان کیوں ہو رہے ہیں۔ آخر دماغ نے ان بے وقوفوں کو سمجھایا کہ شکم سمیت تم سب ایک ہی جان کے مظاہر اور اس کے خدمت گزار ہو۔ ہر ایک کا کام اسے خود بھی نفع پہنچاتا ہے اور کل جسم کو بھی۔ جماعت کے ساتھ ہی ربط رکھنے سے عضو میں زندگی اور قوت ہے۔ فرد و جماعت کے ربط کی اس سے بہتر مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ علامہ اقبال بھی اسی تصور سے آغاز کرتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامہ احرار باش

اس کے بعد ایک حدیث نبویؐ کے حوالے سے کہا ہے کہ شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔ فرد و قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ فرد و ملت کا احترام و نظام ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ فرد کا جماعت میں گم ہونا خودی کو سوخت کرنا نہیں بلکہ قطرے کا قلزم بننا ہے۔ زندگی کے اقدار کا سرمایہ ملت ہی کے گنجینے میں ہوتا ہے۔ نوع انسان جو کچھ قرون میں یہ دوران ارتقاء پیدا کرتی رہی ہے، فرد اس تمام ثروت کا مالک بن

جاتا ہے اور انسانیت کے مستقبل کی طرف بھی جماعت ہی قدم بڑھاتی ہے۔ ماضی اور مستقبل اس کی ذات میں ہم آغوش ہیں۔ افراد پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ لیکن جماعت باقی رہتی ہے۔ فرد کے اندر ترقی کی خواہش بھی جذبہ ملی سے پیدا ہوتی ہے اور خیر و شر کا معیار بھی حیات ملی کی پیداوار ہے۔ انسان کو حیوان ناطق کہتے ہیں لیکن فرد بے جماعت ناطق نہیں ہوسکتا۔ زبان جو ہزار ہا سال کے انسانی تجربات کی سرمایہ دار ہے، کسی ایک فرد کی پیدا کردہ چیز نہیں۔ یہ قیمتی ورثہ جماعت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ گرمی صحبت سے فرد میں ملت کی وسعت آجاتی ہے۔ تمام کثرت وحدت میں منسلک ہو جاتی ہے۔ لفظ کے اندر معنی کی ثروت جملے یا مصرعے کے دوسرے الفاظ سے متحد ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ تنہا فرد کے مقاصد خور و نوش کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں۔ فرد کے مضمرات و ممکنات اگر معرض شہود میں آتے ہیں تو محض ملت کے ربط سے۔ ضبط و نظم سے زندگی کو نشو و نما حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی آزادی جو معاون حیات و ارتقاء ہے وہ جماعتی پابندیوں ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح کہ ندی کے اگر کنارے نہ ہوں، جو اس کی روانی کو حدود کے اندر رکھتے ہیں، تو وہ ندی ہی نہیں بن سکتی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ تو نے خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کو نہیں پہچانا، اس لیے وہم و گمان میں مبتلا ہو گیا ہے اور ان کو باہم متضاد سمجھنے لگا ہے۔ تیری ذات کے اندر ایک جوہر نور ہے۔ اس نفس واحدہ میں دوئی نہیں۔ لیکن مظاہر حیات میں یہ وحدت من و تو کا امتیاز پیدا کر لیتی ہے۔ اس کی فطرت آزاد خود اپنی تکمیل کے لیے آئین کی زنجیریں بناتی ہے۔ اس جزو کے اندر ہمہ گیر قوت ہے۔ پیکارِ حیات اس شمشیر کے لیے سنگ فساں ہے:

غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا

اسی کو خودی کہتے ہیں اور اسی کا نام زندگی ہے۔ جماعت کے اندر گم ہو کر، یعنی بے خودی سے، یہ خودی اپنے آپ کو استوار کرتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئین کے جبر نے اختیار فرد کو سوخت کر دیا ہے، لیکن محبت اسی کا نام ہے کہ محبّ محبوب کی ذات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ خود شکنی سے کس طرح خودی مضبوط ہوتی ہے؟ استدلال کے لیے یہ نکتہ آسانی سے قابل فہم نہیں، اس میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے:

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد است تیز گر نمی فہمی ز پیش ما گریز

اس تمہید کے بعد اقبال نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ انسان کی فطرت میں یکتائی کا جوہر بھی ہے لیکن اس کی حفاظت انجمن آرائی سے ہی ہوتی ہے۔ افراد خود اپنی تکمیل ذات کے لیے اپنے آپ کو ایک لڑی میں پرو لیتے ہیں۔ پیکار حیات میں ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ افلاک پر نظام انجم بھی جذب باہم سے قائم ہے۔ انسانی افراد بھی اسی آئین سے قیام و ثبات حاصل کرتے ہیں۔ ابتدائی حالت میں انسان جب دشت و جبل میں آوارہ تھے تو زندگی کی قوتیں خوابیدہ تھیں، آرزوئیں محدود تھیں:

گوشمال جستجو نا خوردۂ زخمہ ہائے آرزو نا خوردۂ

خون میں گرمی نہیں تھی۔ دیو پری کے اندیشے سے لرزاں تھے۔ عقل وفکر نے بھی ماحول پر غلبہ حاصل نہ کیا تھا۔ برق و رعد سے خائف تھے۔ خودرو چیزیں کھا کر گزارہ کر لیتے تھے۔ اپنی کوشش سے فطرت سے کچھ نہ حاصل کر سکتے تھے۔ ایک انفعالی کیفیت تھی۔ جو کچھ میسر آ گیا اس پر قناعت کر لی۔ اس حالت میں انسان اس وقت نکلا جب کسی جماعت میں ایک مرد صاحب دل پیدا ہوا۔

یہ قرآنی تصور ہے کہ آدمیت کا آغاز نبوت سے ہوا ہے۔ بعض حکما نے کہا ہے کہ ہر علم وفن کا آغاز بھی وحی ہی کی بدولت کی ہوا۔ ایسا شخص انسانوں کو انتشار سے نکال کر ان میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ ''تا دوئی میرد یکی پیدا شود''۔ ایسے مرد صاحب دل کا انداز نظر بالکل تازہ ہوتا ہے۔ وہ ہر شے کو ایک نئی بصیرت سے دیکھتا ہے اور اس سے نئے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس کے اندر زندگی کی حرارت ہوتی ہے جس کی چنگاریاں بے شمار قلبوں میں شعلے پیدا کرتی ہے۔ اس کی بدولت عقل کو بھی ایک نیا پیرایہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ وہ زندگی کے اقدار کی نئی تقدیر کرتا ہے۔ وہمی معبودوں کی پرستش سے انسان کو نجات دلاتا ہے۔ مادّی فطرت کو قوتوں کا خوف دلوں سے زائل کرتا ہے اور انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ تو خدائے خلاق واحد کے سوا کسی کا بندہ نہیں۔ اس کے طفیل میں انسان ایک جماعت بن جاتے ہیں اور توحید الٰہی وحدت انسانی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تمام زندگی کے لیے ایک مقصود معین ہو جاتا ہے:

تا سوے یک مدعایش می کشد حلقہ آئیں بپایش می کشد
نکتہ توحید باز آموزدش رسم و آئین نیاز آموزدش

اس قسم کے توحید آموز اور وحدت آفریں تلمیذ الرحمان کو اسلامی اصطلاح میں نبی کہتے ہیں۔ از آدم تا ایں دم نوع انسان نے جو ترقی کی ہے اور انسان کی بصیرت اور قوت میں جو اضافے ہوئے ہیں، سب کا سرچشمہ نبوت ہی ہے۔

اس کے بعد، ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ، کے عنوان کے تحت رکن اوّل توحید کی شرح ہے۔ انسانی عقل ابتدائی کوششوں میں اپنے ماحول میں اشیا وحوادث کا فرداً فرداً ادراک کر کے ان کے ساتھ کوئی ہنگامی توافق پیدا کرتی رہی۔ ابھی تک ایسا شعور پیدا نہ ہوا تھا جو مظاہر کی گونا گونی اور کثرت کو کسی وحدت سے منسلک کر سکے۔ عقل کا پہلا ارتقائی قدم توحید کی بدولت اٹھا، ورنہ عقل کے لیے خود اپنا مقصود واضح نہ تھا۔ فطرت کی تسخیر فہم فطرت کے ساتھ وابستہ ہے اور اس فہم کا کام حوادث کی کثرت میں آئین کی وحدت تلاش کرنا ہے:

در جہان کیف و کم گردید عقل پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ این بے چارہ را منزل کجاست کشتی ادراک را ساحل کجاست

کم فہم لوگ دین اور دانش کو الگ الگ بلکہ متضاد چیزیں سمجھتے ہیں۔ اگر نکتہ توحید ان کی سمجھ میں آجائے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو کہ توحید کی پیدا کردہ وحدت کوشی ہی دین اور حکمت دونوں کا سرچشمہ ہے اور تمام قسم کی قوتیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں:

دین ازو، حکمت ازو، آئیں ازو زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو

عالموں کی حیرت اور عاشقوں کی قوت عمل اسی زاویہ نگاہ کا نتیجہ ہیں۔ یہی عقیدہ خاک کو اکسیر بناتا ہے۔ اس سے انسان کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ انسان راہ حق میں گرم رو ہو جاتا ہے۔ شک اور خوف کی جگہ یقین محکم پیدا ہوتا ہے، چشم بصیرت پر ضمیر کائنات کا انکشاف ہوتا ہے۔

کلمہ توحید ہی ملت بیضا کے تن میں بطور جان ہے۔ یہی عقیدہ ملت کا شیرازہ بند ہے۔ اسی سے زندگی میں قوت کا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی سے تو وہ گل دل بن جاتا ہے اور دل میں سے اگر یہ نکل جائے تو دل مٹی ہو جاتا ہے۔ مسلمان کی اصلی دولت یہی ہے۔ اسی توحید نے اسود و احمر کی تمیز مٹائی اور بلال حبشی (رضی اللہ عنہ) فاروق (رضی اللہ عنہ) اور ابوذر (رضی اللہ عنہ) کا ہمسر ہو گیا۔ ملت نہ جغرافیائی چیز ہے اور نہ نسلی یا لسانی۔ بقول شاعر ''ہم دلی از ہم زبان بہتر است'' ملت دلوں کی یک رنگی اور ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ بات توحید ہی کی برکت سے ظاہر ہوتی ہے:

ملت از یک رنگی دلہاستے روشن از یک جلوہ سیناستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے

ملت اسے کہتے ہیں جس میں خیر و شر اور خوب و زشت کا معیار یکساں ہو۔ یہ اتحاد خدائے واحد ہی کی بخشی ہوئی بصیرت کا نتیجہ ہو سکتا ہے، ورنہ ہر شخص خود اپنے لیے معیار بن جائے اور انسانی وحدت کا شیرازہ بکھر جائے۔ بعض ملتوں نے اپنی تقدیر کو وطن کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ بعض نے اتحاد ملت کی تعمیر نسل و نسب کی بنیادوں پر قائم کی ہے۔ لیکن وطن پرستی خدا پرستی نہیں، وہ ایک خطہ ارض کی پرستش ہے، اسی طرح نسب کا مدار جسمانی توارث پر ہے، لیکن انسان کی ماہیت جسم نہیں بلکہ روح ہے۔ ملت اسلامیہ کی اساس نفسی ہے۔ یہ ایک غیر مرئی رشتہ ہے، جس طرح تجاذب انجم کے تار کسی کو نظر نہیں آتے مگر وہی نظام انجم کے قوام ہیں۔ اس قسم کی وحدت نفسی توحید پرستوں کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتی۔

قرآن نے جہاں نفس مطمئنہ اور نجات یافتہ، خدا رس انسان کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے دو ہی صفات بالتکرار بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسا انسان یاس و حزن و غم سے پاک ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ کسی قسم کا

خوف اس کے دل میں نہیں رہتا۔ اسی صفت کا نام حریت ہے اور یہ توحید ہی کا ثمر ہے۔ مردِ موحد کبھی نا اُمید نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس کے نزدیک نا اُمیدی کفر ہے۔ اُمید سے زندگی کی قوتیں پیدا اور استوار ہوتی ہیں اور یاس سم قاتل کا کام کرتی ہے۔ قطع اُمید سے انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مایوس انسان کے عناصر سست ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ غم انسان کی جان کو کھا جاتا ہے مسلمانوں کو خدا اور رسولؐ نے ''لا تحزن'' کی تعلیم دی ہے اور نصب العین لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون قرار دیا ہے:

گر خدا داری ز غم آزاد شو　　از خیال بیش و کم آزاد شو

اسی قوت سے موسیٰ (علیہ السلام) فرعون کے مقابل میں کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کو غرقاب کرتا ہے۔ غیر اللہ کا خوف عمل کا دشمن ہے لیکن خدا پر یقین ہمت عالی کا منبع ہے۔ خوف سے فکر و عمل کی تمام قوتیں بے کار ہو جاتی ہیں اور انسان خود مسخر و مغلوب ہو جاتا ہے۔ جس شخص کو سست عمل دیکھو سمجھ لو کہ اس کے دل میں خوف نے جگہ کر لی ہے۔

جدید نفسیات نے کوئی پچاس قسم کے 'فوبیا' یعنی خوف کی قسمیں دریافت کی ہیں جو انسان کے تحت الشعور میں داخل ہو کر اس کے نفس میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ 'نفسیات تحلیلی' ان چوروں کو قلب کے تہ خانوں سے نکالنے کی تجویزیں کرتی رہتی ہیں، لیکن خود ایک بڑا ماہر نفسیات جدید، ینگ اس کا اقرار کرتا ہے کہ خدا پر راسخ عقیدہ رکھنے والے ان خوفوں اور نفسی پیچیدگیوں سے بری ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا علاج عقیدہ توحید ہے:

ہر شے پنہاں کہ اندر قلب تست　　اصل او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ　　ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

موحد کے دل بے ہراس کے متعلق ایک تمثیل پیش کی ہے کہ حزن و خوف سے بری انسان میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ حوادث کے تیر اس پر بے اثر ہو جاتے ہیں۔ تیر شمشیر سے کہتا ہے کہ میں کسی کے سینے میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ اس کے اندر دل یاس و بیم میں مبتلا ہے یا نہیں۔ جہاں میں نے دیکھا کہ یہ شخص مایوس اور ڈرپوک معلوم ہوتا ہے، وہاں میں دھڑلے سے اس کی خوں ریزی کرتا ہوں، لیکن اگر سینے کے اندر قلب مومن نظر آئے تو میں اس کی حرارت سے پگھل کر پانی ہو جاتا ہوں:

در صفائے او ز قلب مومن است　　ظاہرش روشن ز نور باطن است
از تف او آب گردد جان من　　ہمچو شبنم می چکد پیکان من

اس نظم میں بے خودی کا مفہوم اس لحاظ سے داخل ہے کہ جب خودی میں سے خوف و حزن کے عناصر ناپید ہو جائیں تو اس قسم کی بے خودی کی حالت مستی و مدہوشی کے مماثل نہیں ہوتی بلکہ حوادث کے مقابلے

میں نا قابلِ شکست حصن مدافعت بن جاتی ہے۔ خودی اور بے خودی میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ اسی خیال کو 'حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیر' میں ایک تاریخی واقعے سے استوار کیا ہے۔ نماز عاشقاں میں ایک بے خودی کی کیفیت ہوتی ہے کیوں کہ نفس انسانی اپنے تئیں کلیتاً خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس سپردگی کی بدولت اس میں بے حد قوت اور بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیر نے عالمگیر پر دوران نماز میں حملہ کیا۔ کوئی معمولی انسان خوف زدگی میں شیر کا شکار ہو جاتا ہے یا بے اختیار فرار کی کوشش کرتا لیکن عالمگیر کی بے خودی میں خودی کی طاقت دیکھیے:

دست شہ نادیدہ خنجر برکشید　　شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود را ہے نداد اندیشہ را　　شیر قالیں کرد شیر بیشہ را

ایسے نفس میں خودنمائی کے ساتھ خودشکنی ہوتی ہے، لیکن یہی خودشکنی الٰہی قوتوں کی جاذب بن جاتی ہے:

ایں چنیں دل خود نما و خود شکن　　دارد اندر سینہ مومن وطن

بعض اوقات لوگوں کو لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی صفت پڑھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ ماسوا کا خوف معدوم ہونے پر بھی خدا کا خوف تو باقی رہتا ہے، اس لیے بندہ مومن مطلقاً لا خوف تو نہ ہوا۔ لیکن یہ دھوکا انسانی زبان کی کوتاہی سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا کے خوف کے وہ معنی نہیں جو ماسوا کے خوف کے معنی ہیں۔ خدا کوئی ڈراؤنی چیز نہیں ہے جسے دیکھ کر انسان کانپنے لگے۔ وہ تو سراپا رحمت و شفقت ہے۔ خوف خدا کے معنی ہیں حکم خداوندی اور آئین الٰہی کی خلاف ورزی کے دردناک نتائج فطری ہیں۔ انھیں معنوں میں خوف خدا کو حکمت کا سرچشمہ کہا گیا ہے۔ ماسوا کا خوف تو انسان کو حواس باختہ اور عقل سوختہ کر دیتا ہے۔ خوف خدا کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ ایک فرمان بردار بچہ سراپا شفقت ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے سے گریز کرتا ہے تاکہ محبت کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ یہاں سزا کا خوف نہیں ہوتا بلکہ محبت کے فقدان کا خوف ہوتا ہے۔ ان معنوں میں خدا ہی کا خوف انسان کو ہر قسم کے خوف حوادث سے نجات دلوا سکتا ہے:

عشق را آتش زن اندیشہ کن　　روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس　　خوف غیر از شرک پنہاں است و بس

خدا کے سوا کسی چیز سے خائف انسان کلمہ لا الٰہ الا اللہ زبان سے پڑھنے کے باوجود اندر سے شرکِ خفی میں مبتلا ہوتا ہے۔

رموزِ بیخودی میں اقبال پہلے اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ انسانوں میں ملت آفریں وحدت ان مردان حق کی بدولت پیدا ہوئی ہے جنھیں اصطلاحاً نبی کہتے ہیں۔ اس سے قبل اس عنوان کے تحت اشعار

درج ہو چکے ہیں کہ 'ملت از اختلاط افراد پیدا می شود و تکمیل تربیت او از نبوت است' اسلام کا ''رکن دوم'' ''رسالت'' ایک مخصوص تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انبیا تو آدمؑ سے لے کر محمدؐ تک لاتعداد ہوئے ہیں لیکن قرآن کریم نے مسلمانوں کو ملت ابراہیمؑ کہا، اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ کا توحید کی تعمیر اور شرک کی بیخ کنی میں جہاد تاریخ دین کا ایک اہم واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ توریت وانجیل سے پہلے کا زمانہ ہے، اس لیے توحیدی رموز میں ان کو تمام انبیائے بنی اسرائیل پر زمانی سبقت حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی بنیادیں قائم کیں تو اس وقت نہ کوئی یہودی تھا اور نہ کوئی نصرانی۔ یہ سب بعد کے، کم وبیش بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ اس لیے توحید کو بھی خالص کرنے کے لیے موحد قدیم حضرت ابراہیمؑ کی ہی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ پہاڑ میں سے نکلتے ہوئے چشمے کا پانی صاف ہوتا ہے، بعد میں بہتی ہوئی ندیوں میں خس و خاشاک اور کثافت کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ رسالت کی توضیح میں علامہ اقبال، ابراہیمؑ خلیل اللہ ہی سے آغاز کرتے ہیں:

تارک آفل براہیم خلیلؑ   انبیا را نقش پائے او دلیل

جس طرح عقیدۂ توحید وحدت آفریں ہے، اسی طرح رسالت کا بھی یہی وظیفہ ہے کہ ہزار ہا انسان ایک عدل عام اور رحمت عامہ کی سلک میں منسلک ہو جائیں:

از رسالت در جہاں تکوین ما   از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است   جزو ما از جزو ما لاینفک است

ابراہیمی رسالت نے جن بنیادوں کو اُستوار کیا اور رسالت محمدیؐ نے ان پر جو عظیم الشان تعمیر انسانیت کھڑی کی، اسی کی بدولت توحید پرستوں کی ایک ملت بن گئی جو اہلِ عالم کے لیے پیامِ رحمت ہے۔ رسولؐ کی محبت خدا کی محبت کا وسیلہ ہے۔ کوئی فرد شاید براہِ راست بھی راہبوں کی طرح خدا سے رابطہ پیدا کرے، لیکن ملت کی شیرازہ بندتو رسالت ہی ہے:

فرد از حق، ملت از وے زندہ است   از شعاع مہر او تابندہ است

رسالت کی بدولت لاتعداد انسان ہم نوا اور ہم مدعا ہو جاتے ہیں۔ کثرت اس وحدت میں آ کر زندہ تر ہو جاتی ہے۔ دین فطرت کا تقاضا اسی قسم کی وحدت آفرینی ہے۔ رسالت محمدیؐ کی پیدا کردہ وحدت اگر ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹے تو ہم ابد پیوند ہو سکتے ہیں۔ افراد پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں لیکن ایسی عالمگیر ملت قائم و دائم رہ سکتی ہے محمد رسول اللہؐ پر رسالت کے مقصد کی تکمیل ہوگئی۔ اس پر اب کوئی انسان بنیادی حقائق کا اضافہ نہیں کرسکتا۔ جس طرح محمدؐ خاتم النبیین ہیں اسی طرح ان کی اُمت خاتم الامم ہے۔ اس کے علاوہ جو ملتیں قائم ہوں گی وہ آئین فطرت کے خلاف ہوں گی، یا جغرافیائی ہوں گی یا نسلی، یا لسانی۔ ان

میں سے کسی کو بقا حاصل نہیں ہوسکتی۔ حق کے مقابل میں باطل کی عمر نہایت قلیل ہوتی ہے۔ اب کوئی نئی نبوت اس سے وسیع تر وحدت پیدا نہیں کرسکتی۔ البتہ کسی جدید دعوائے نبوت سے انسانوں میں مزید تفریق و تفرقہ پیدا ہوسکتا ہے:

لا نبی بعدی ز احسان خدا است — پردہ ناموس دین مصطفیؐ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو — حفظ سر وحدت ملت ازو
دل ز غیر اللہ مسلمان می گند — نعرۂ 'لا قوم بعدی' می زند

اس عقیدے کی نسبت یہ اعتراض پیدا ہوسکتا ہے کہ مسلمان تمام نوع انسان تو نہیں۔ مسلمانوں کی باہمی اخوت رنگ و نسل و وطن سے بالاتر سہی، لیکن دُنیا کی کثیر آبادی تو ان سے باہر ہے، اس لیے اسلام کی اخوت عالم گیر اخوت تو نہ ہوئی۔ یہی اعتراض اسرارِ خودی کے انگریز مترجم پروفیسر نکلسن نے کیا تھا۔ اس کا جواب اقبال نے نہایت مدلل اور مسکت دیا تھا کہ اسلام کا مقصود عالم گیر محبت و اخوت ہے لیکن جب تک ایک ملت اس کی مثال قائم نہ کرے اور دوسروں کے لیے نمونہ نہ بنے، تب تک اخوت کی حدیں وسیع نہیں ہوسکتیں۔ اقبال نے اس جواب میں اپنا پختہ یقین بیان کیا کہ میرے نزدیک اُمت محمدیہؐ کا خاص مشن یہی ہے کہ وہ عالم گیر اخوت کے اُصول کا عملی جامہ پہنائے۔ چنانچہ رموزِ بیخودی میں اس مضمون کے لیے ایک خاص عنوان قائم کیا ہے، درمعنی ایں کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است، اس عنوان کے تحت یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کا پیغام تمام نوع انسان کے لیے آزادی، برابری اور برادری کا پیغام ہے۔ اسلام نے جو کچھ تلقین کی اور اپنی خالص حالت میں جو معاشرت، معیشت اور سیاست پیدا کی اس نے تمام انسانوں کی گردنوں میں سے طوق اور دست و پا سے غلامی اور استبداد کی زنجیریں توڑ دیں۔ انسان انسانوں کی پوجا کرتے تھے۔ ارباب من دون اللہ معبود بنے ہوئے تھے۔ لا قیصر و لا کسریٰ کا اعلان اسلام نے کیا۔ کاہن و پاپا و سلطان و امیر سب مل کر انسانوں کا شکار کرتے۔ کلیسا جنت کے پروانے ابلہان فریب خوردہ کے ہاتھ بیچتا تھا۔ برہمن نجات کے کمیشن ایجنٹ بنے ہوئے تھے۔ مذہب استحصال جاہ و مال کا آلہ بن گیا تھا۔ فطرت انسانوں کو آزاد پیدا کرتی تھی، لیکن وہ مہد سے لحد تک طرح طرح کے توہمات اور استبداد کی زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔ خدا نے جو امانت آدم کے سپرد کی تھی وہ اس سے چھن چکی تھی۔ جب زبونی حال اس درجے کو پہنچی تو رحمت حق جوش میں آئی اور حق بحق دار سپردن کا دور شروع ہو۔ یہ اسی نبیؐ کی بدولت ہوا جس کو اس کے ہم وطن لوگ نبوت سے قبل بھی امین کہتے تھے:

تا امینے حق بہ حق داراں سپرد — بندگان را مسند خاقان سپرد

اب مکرم و معظم ہونے کا ایک ہی معیار رہ گیا، ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم جو سیرت میں افضل ہے وہی سردار ہے، خواہ وہ ایک نادار حبشی ہی ہو۔ انسانیت کے لیے یہ کام اور کس نے کیا؟ فقط حریت و اخوت و مساوات کے نعرے لگاتے رہے تاکہ اس دھوکے سے عوام کا شکار کرتے رہیں۔ محنت کش کسان اور مزدور کے لیے الکاسب حبیب اللّٰہ کس نے کہا؟ یہ تمام اصنام کہن اسلام نے توڑے۔ یہ کسی ایک ملت پر احسان نہ تھا بلکہ تمام انسانیت میں ایک تازہ جان آفرینی تھی:

تازہ جان اندر تن آدم دمید　　بندہ را باز از خداوندان خرید

اسلام صحیح معنوں میں انقلاب تھا، وہ دُنیائے کہن کی موت اور عالم جدید کی تکوین تھی۔ دین اور ضمیر کے معاملے میں ہر قسم کا جبر ممنوع ہو گیا۔ حریت و مساوات کی تحریکیں عصر نو میں بھی پیدا ہوئی ہیں، لیکن تاریخ انسانی میں یہ تمام تقاضے اسلام کے منشور میں داخل ہو کر پہلے پہل منصۂ شہود پر آئے:

حریت زاد از ضمیر پاک او　　ایں مَے نوشیں چکید از تاک او
عصر نو کایں صد چراغ آوردہ است　　چشم در آغوش او وا کردہ است

جس اسلام نے کل مومن اخوۃ کہا، اسی نے تمام نوع انسان کی وحدت کی حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ تمام انسان، مرد و زن گورے کالے، امیر و غریب ایک نفس واحد کے اعضا ہیں۔ اخوت اور مساوات اسلام کی نہاد میں ہیں۔ جو کوئی جس حد تک اخوت، مساوات اور حریت کو لائحہ عمل بناتا ہے اسی قدر وہ مسلم و مومن ہے۔

اس کے بعد تاریخ اسلام سے مساوات ورزی کی کچھ مثالیں بیان کی ہیں۔ ایرانیوں کے خلاف جنگ میں ان کا سپہ سالار جابان گرفتار ہو گیا۔ اس نے یہ نہ بتایا کہ میں کون ہوں اور ایک معمولی سپاہی سے امان طلبی کی۔ اس نے اسے امان دی اور وعدہ کیا کہ تمھیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ جنگ کے ختم ہونے پر معلوم ہوا کہ وہ اوّل نمبر کا جنگی مجرم ہے۔ سب نے ابوعبیدہ سپہ سالار سے کہا کہ اس کو قتل کرنا لازمی ہے۔ ابوعبیدہ سپہ سالار عسکر اسلامی نے کہا کہ اے مسلمانو! ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک کا وعدہ سب کا وعدہ ہے۔ امان دینے والا معمولی سپاہی سہی لیکن ہماری ملت کا فرد ہے۔ ہمیں اس کا پاس ہونا چاہیے۔ ملت کی یک آہنگی بڑے سے بڑے جبّار قاتل کے قتل کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے:

نعرۂ حیدر نوائے بو ذراست　　گرچہ از حلق بلال و قنبر است
ہر یکے از ما امین ملت است　　صلح و کینش صلح و کین ملت است

اس کے بعد سلطان مراد اور معمار کا قصہ بیان کیا ہے۔ ایک معمار کی تعمیر سلطان کو پسند نہ آئی اور خشم گین ہو کر اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس نے قاضی کے ہاں نالش کی۔ قاضی نے سلطان کو عدالت میں طلب

کیا۔ ایک طرف معمار دست بریدہ وستم رسیدہ فریادی ہے اور دوسری طرف ایک وسیع مملکت کا شہنشاہ شرمندہ کھڑا ہے۔ سلطان نے جرم کا اقبال کیا۔ قاضی نے کہا کہ از روئے قرآن قصاص واجب ہے۔ شریعت سلطان اور معمولی انسان کے حقوق وفرائض میں فرق روانہیں رکھتی:

عہد مسلم کمتر از احرار نیست خون شہ رنگیں تر از معما نیست

سلطان نے اپنا ہاتھ پیش کیا کہ قصاص میں اس کو کاٹ دیا جائے مدعی نے کہا کہ خدا نے قصاص کا حکم بھی دیا ہے لیکن عدل واحسان کو افضل قرار دیا ہے:

گفت از بہر خدا بخشیدمش از برائے مصطفیٰؐ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر سطوت آئین پیغمبرؐ نگر
پیش قرآن بندہ و مولا یکے ست بوریا و مسند دیبا یکے ست

حریت کی مثال میں اقبال نے امام الشہدا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے جگر گداز واقعے کو نظم کیا ہے۔ اسلام نے شہنشاہی اور سلطانی کا خاتمہ کر کے انسان کی حریت کو محفوظ کیا تھا، کیوں کہ مطلق العنان سلطانی جو عادل وظالم، عاقل واحمق کو ورثے میں ملتی رہے ہر قسم کے استبداد کا مسموم سرچشمہ ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ تک حریت کا یہ عالم تھا کہ معمولی فرد بھی خلیفہ پر نالش کر کے اس کو عدالت میں پیش ہونے پر مجبور کرسکتا تھا اور عورتیں مجمع عام میں امیر المومنین سے معمولی باتوں میں بھی باز پرس کرتی تھیں اور اس کے کسی غیر قرآنی فتویٰ کے خلاف احتجاج کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ جیسے بارعب خلیفہ سے بھی کوئی مرعوب نہ ہوتا تھا بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھے۔ مساوات وحریت کا یہ نمونہ چشم آفتاب نے اس دُنیا کی سطح پر پھر کبھی نہ دیکھا۔ مگر جب خلافت سلطنت میں تبدیل ہوگئی تو تھوڑے ہی عرصے میں وہی قیصریت واپس آ گئی جس کی بیخ کنی اسلام کا فرض اوّلین تھا۔ ایک مرد مجاہد وحق پرست، رسول اللہؐ و بتول کا پروردہ آغوش اور حیدر کرار کا فرزند ارجمند، اس حریت کشی اور اسلام سوزی کو برداشت نہ کر سکا۔ حضرت امام حسینؓ نے استبدادی سیاست کے خلاف حق کا علم بلند کیا اور حریت کی حفاظت میں اپنی اور اہل وعیال کی جانیں قربان کر دیں۔ مسلمانوں کا ایک گروہ آج تک اس پر ماتم کرتا ہے۔ لیکن اس امام احرار کی حریت پروری اور استبدادی کشی کو کسی نے اپنا مسلک نہ بنایا۔ اب حریت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے کی ضرورت ہے۔

عقل وعشق کا موازنہ اقبال کا ایک خاص مضمون ہے۔ حضرت امام حسینؓ کے ذکر میں بھی شروع میں پندرہ اشعار عقل حیلہ کی تحقیر اور عشق کی مدح میں ہیں۔ اس موازنے میں نہایت لطیف نکات پیدا کیے ہیں۔ اقبال کا مقصود یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کے اندر عشق کی جذبہ انگیزی اور قوت ایثار کا نقشہ کھینچا جائے۔ اگر حضرت امام حسینؓ میں صرف عقل مصلحت اندیش ہوتی تو کمزور ایمان والے مسلمانوں کی طرح وہ بھی

خاموشی سے یزید کی ولی عہدی کو تسلیم کر لیتے۔ حریت اور عشق ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ حضرت سیّد الشہدا حریت کی حمایت میں انتہائی قربانی پر آمادہ ہوئے۔ یہ جذبہ بھی زندگی کے اعلیٰ اقدار کے عشق ہی کا مظہر ہے:

عشق را آرام جاں حریت است ناقہ اش را ساربان حریت است

دُنیا ہمیشہ خیر و شر کی قوتوں کا میدان کارزار رہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون اور حسینؓ و یزید زندگی کی دو مختلف قوتوں کے نمائندے ہیں۔ خلافت کو سلطنت بنا دینا گویا موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون کی حمایت کے مترادف تھا:

چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت حریت را زہر اندر کام ریخت

حریت کا علم بردار سر بکف اٹھا، وہ انسانیت کے لیے ایک سحاب رحمت تھا:

بر زمین کربلا بارید و رفت لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد موج خون او چمن ایجاد کرد
ماسواللہ را مسلمان بندہ نیست پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

علامہ اقبال اپنی شاعری کی ابتدا میں وطنیت کے ترانے الاپ کر بصیرت اندوزی کے ساتھ اس بت پرستی سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اس انقلاب نظر کے بعد اُنھوں نے فارسی اور اُردو میں وطن پرستی کے خلاف ایک مسلسل جہاد کیا۔ رموزِ بیخودی میں بھی یہ مضمون ایک خاص انداز میں موجود ہے۔ اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں کہ ملت اسلامیہ ایک ابد قرار ملت ہے کیونکہ اس کی تعلیم حیات ابدی کی تعلیم ہے اور اس کے اُصول فرت کے اُصول ہیں جن کی نسبت قرآن میں ارشاد ہے:

فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیھا۔ لا تبدل لخق اللّٰہ اس سے لازم آتا ہے کہ اس ملت میں کوئی نہایت زمانی نہ ہو۔ اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں کہ لازمانی ہونے کی طرح یہ ملت لامکانی بھی ہے یہ کسی خطہِ ارض کے ساتھ وابستہ نہیں:

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

یہ بانگِ درا وہی لا الٰہ اللہ ہے جس سے ماوریٰ کوئی حقیقت نہیں۔ مسلمان کا وطن اسلام ہے، جس طرح ایک مقتدر اصحابی نے اپنا نسب اسلام بتایا تھا۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام ایک روحانی نظریہ ہے اور اس خاک دان سے اس کا کوئی لازمی رشتہ نہیں۔

قلب ما از ہند و روم و شام نیست مرزبوم او بجز اسلام نیست

رسول کریم ﷺ کو حضرت کعب نے قصیدے میں سیف الہند کہا جو فولاد کی خوبی اور تیزی کے لیے مشہور تھی۔ رسول کریم ﷺ نے کہا کہ سیف الہند نہیں سیف اللہ کہو۔ اس سے اقبال نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ اپنے پیغام اور اسلام کو کسی خطہ ارض کے ساتھ وابستہ کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ اسی طرح اس دُنیائے ارض کو ایک مشہور حدیث میں دنیاکم یعنی تمہاری دُنیا کہا ہے۔ جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں اس عالم خاکی کا باشندہ نہ سمجھتے تھے۔ وہ یہاں چند روزہ مہمان اور مسافر تھے۔ ہجرت میں بھی یہ تعلیم مضمر تھی کہ اسلام کے مقابلے میں وطن کوئی چیز نہیں۔ رسول کریمؐ نے تمام روئے زمین کو مسجد کہا۔ زمین کا کوئی مخصوص ٹکڑا یا مخصوص معبد ہی خدا کا گھر نہیں۔ جس طرح خدا کسی خطے میں محصور نہیں اسی طرح بندہ خدا کے لیے شرق و غرب برابر ہیں۔ وللّٰہ المشرق والمغرب، فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ خدا نے جس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اس کو مکے سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ مکے میں رہتے ہوئے بھی خدا دشمنوں کا قلع قمع کر سکتا تھا۔ ہجرت فقط وطن پرستی کے خلاف ایک موثر تلقین تھی:

صورت ماہی بہ بحر آباد شو — یعنی از قید مقام آزاد شو
ہر کہ از قید جہات آزاد شد — چوں فلک درشش جہت آباد شد

اسلام کا مقصود نوع انسان کی وحدت ہے۔ مغرب کی قومیت پروری اور وطن پرستی نے جغرافیائی حدود کے اِدھر اور اُدھر رہنے والوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ اب مجلس اقوام بنا کر اس مہلک بیماری کا علاج کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل علاج تب ہوگا جب مجلس اقوام کی جگہ مجلس انسان بنے گی۔ موجودہ مجلس میں تو اقوام ہی کی رسہ کشی اور حیلہ سازی نظر آتی ہے اور ظاہری کوشش صلح گرگ آشتی ہے۔ اصل خلل زاویہ نظر میں ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
مردی اندر جہان افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت وہفت اندام ماند — آدمیت کم شد و اقوام ماند

مغرب میں دین کو کچھ مادّیت نے سوخت کیا اور کچھ وطنیت نے جو مادّیت ہی کی ایک صورت ہے۔ وطن پرستی اور مملکت پرستی نے مغرب میں شیطان کا ایک مرسل بھیج دیا جس کا نام میکیا ویلی ہے۔ اس نے یہ تلقین کی کہ وطن اور مملکت کی حمایت اور قوت افزائی کے لیے عدل و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ فرنگ اسی مرسل شیطان کے صحیفے کا معتقد اور اسی پر عامل ہے۔ فرنگیوں کے ہاں مملکت معبود بن گئی ہے۔ مسلمانوں نے بھی اگر اس کی تقلید کی تو وہ بھی دین سے بیگانہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اقبال پھر اس خیال کی طرف عود کرتا ہے کہ ملت اسلامیہ کبھی زمانے کی دستبرد سے کالعدم

نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم نے اُمتوں کے متعلق ایک کلیہ بیان کیا ہے ولکل امة اجل۔ اذا اجلهم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون اقبال کہتا ہے کہ ملت اسلامیہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ جن اُمتوں کو ازمنہ ماضیہ میں اجل آئی یا آئندہ اجل کا شکار ہوں گی ان کی اساس ابدی حقائق پر نہ تھی۔ اگر اسلام کا چراغ کفر کی پھونکوں سے بجھ نہیں سکتا تو لازم ہے کہ اس پر کار بند اُمت کا چراغ حیات بھی ہمیشہ روشن ہے:

گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد — از اجل فرماں پذیرد مثل فرد
اُمت مسلم ز آیات خداست — اصلش از ہنگامہ قالوا بلیٰ است
از اجل ایں قوم بے پرواستے — اُستوار از نحن نزلنا ستے

تیرہ چودہ صدیوں میں ملت اسلامیہ پر قیامت خیز آفتیں آئیں، کبھی اپنے اعمال کی پاداش میں اور کبھی حوادث روزگار سے لیکن اس کی راکھ میں جو چنگاریاں تھیں ان کی بدولت پھر نئے سرے سے حرارت حیات پیدا ہوتی رہی۔ یورش تاتار سے صرف بغداد بلکہ عالمی اسلامی کے بیشتر حصے میں ایسی قیامت نازل ہوئی جو روما پر وحشی اقوام کے حملوں سے بھی طاری نہ ہوئی تھی۔ کفار، خلافت کے جذبے اور روح کو ٹھکرا کر مسند نشین ہو گئے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا چراغ بجھ گیا ہے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے یہی آتش تاتار گلزار ابراہیم بن گئی:

آتش تاتاریاں گلزار کیست — شعلہ ہائے او گل دستار کیست

تاریخِ اسلام میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ مسلمان ایک طرف کمزور اور بے بس ہوئے تو دوسری طرف ان کا گلبہ ہو گیا۔ اندلس میں ان کا دور دورہ ختم ہو گیا تو مشرقی فرنگ میں ترکوں نے اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اُدھر ترک مشرقی یورپ میں سے نکلے تو دورِ حاضر میں ایک طرف پاکستان جیسی عظیم الشان اسلامی مملکت قائم ہوگئی، دوسری طرف مشرقی اقصیٰ میں انڈونیشیا میں ایک کثیر التعداد اسلامی ملت آزاد ہوگئی:

شعلہ ہائے انقلاب روز گار — چوں بباغ ما رسد گردد بہار

تاریخ عالم نے کئی عظیم القوت ملتوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا لیکن:

در جہاں بانگ اذاں بود است و ہست — ملت اسلامیاں بود است و ہست
ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(حافظ)

اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ ملت کی صورت بندی آئین سے ہوتی ہے اور ملت اسلامیہ کا آئین کا مخزن قرآن حکیم ہے:

دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے — موج کو آزادیاں سامان شیون ہوگئیں

ملتے را رفت چوں آئین ز دست مثل خاک اجزائے او از ہم شکست

قرآن نے اسلام کو دین فطرت قرار دے کر لا تبدیل لخلق اللّٰہ کے اُصول کے مطابق جو سرمدی حقائق حیات بیان کیے ہیں وہ زمانے کے تغیرات کی پیداوار نہیں اور نہ مرور ایام سے ان میں کہنگی پیدا ہو سکتی ہے اسی آئین کو قرآن حکمت بھی کہتا ہے اور حکمت کے مفہوم میں کلیت اور زمان و مکان سے ماورائیت داخل ہے:

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لا یزال است و قدیم

اس کی تعلیم غلاموں کو احرار بنا دیتی ہے اور ضعیفوں کو قوت بخشتی ہے۔ اس نے ارتقا کی راہیں کشادہ کر دی ہیں۔ اسی کی بدولت ان پڑھ صحرائیوں نے دُنیا میں علوم وفنون کا چراغاں کر دیا۔ موحد بچوں کے سینے بھی اس امانت کے امین ہیں جسے دست وجبل نے زہرہ گداز سمجھ کر قبول نہ کیا تھا۔ تاریخ عالم میں صحرائی اور کوہستانی وحشیوں کے ٹڈی دل کئی مرتبہ متمدن دُنیا پر نازل ہوئے۔ مگر پُرانی تہذیبوں کے تاخت وتاراج کے بعد حیات انسانی میں کوئی وسعت اور ثروت افکار واقدار پیدا نہ کر سکے۔ لیکن ان صحرائیوں نے قرآن سے فیض اور قوت حاصل کر کے قیصر وکسریٰ کے تخت ہی نہیں اُلٹے بلکہ انسانوں کو غلامی کی زنجیروں اور توہمات کے طوق سے آزاد کیا۔ اس وقت جو ملت اسلامیہ میں ضعف نظر آتا ہے تو اس کی وجہ قرآن سے تغافل ہے۔ اب قرآن سے کسی کو وجد نہیں آتا لیکن جامی اور عراقی کی غزلیں قوالی میں چنگ ورباب کے ساتھ گائی جائیں تو ایک جھوٹا جوش اور مستی پیدا ہو جاتی ہے:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن
صوفی پشمینہ پوش حال مست از شراب نغمہ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش در نمی سازد بقرآن محفلش

خطیب کا کام اب فروعات کی جنگ ہے۔ ضعیف وشاذ ومرسل حدیثوں کی بحث میں قرآن طاق نسیاں پر دھرا رہتا ہے۔ احادیث میں غلو نے یہاں تک نوبت پہنچائی ہے کہ بعض احادیث کو نصوصِ قرآنی کا ناسخ بنا دیا ہے نعوذ باللہ من ذالک:

از خطیب و دیلمی گفتار او با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

قرآن اب یا بے سمجھے طوطے کی طرح رٹا جاتا ہے یا کسی مسلمان کی وفات پر ملا حلوا مانڈا اجرت میں لے کر اس کے دو ایک سپارے بڑی سرعت سے پڑھ جاتا ہے یا پھر فال کے لیے استعمال ہوتا ہے یا تبرکاً بیمار کو اس کے اوراق کی ہوا دی جاتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اس کے بعد ایک مضمون ہے جو بظاہر اقبال کی عام تلقین کے منافی معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت اس

میں کوئی تضاد نہیں۔ اقبال نے بالتکرار سینکڑوں اشعار میں تقلید کی مذمت کی ہے اور تحقیق کی رغبت دلائی ہے۔ اجتہاد کے متعلق اقبال کے تصورات خطبات اور اشعار میں ایسے ملتے ہیں جن کو پڑھ کر مقلدوں کو اس کی جرات پر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن اقبال جب ملت اسلامیہ کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کوئی گروہ ایسا دکھائی نہیں دیتا جو اسلامی روح کے مطابق اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اور جو لوگ اجتہاد کی جرات کرتے ہیں وہ آزاد خیالی میں یا تقلید فرنگ میں اسلام سے سے دور جا پڑتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں ایسے خام مدعان اجتہاد کی بجائے اسلاف کی تقلید بہتر ہے۔ بچوں کی عقل جب تک علم اور تجربے سے پختہ نہیں ہوتی تب تک ان کی تربیت کا مدار تقلید پر ہوتا ہے۔ اس انحطاط کے دور میں بھی اقوام عقل و حکمت کے بارے میں طفل نابالغ بن جاتی ہیں یا پیر فرتوت کی طرح جدت افکار و اعمال کے نا قابل ہو جاتی ہیں۔ جب قوم میں زندگی کے چشمے خشک ہو جائیں تو وہ روایت پرست اور مقلد ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ تقلید اور روایت پرستی میں کسی ہمت اور جرات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مسلمانوں میں اس وقت ایک طبقہ جامد اور کورانہ تقلید اسلاف میں زندگی کی ارتقائی کوششوں کے لیے نا اہل ہو گیا ہے اور دوسرا طبقہ مغرب زدہ روشن خیالوں کا ہے، جن کے لیے تہذیب جدید کا ہر نظریہ اور ہر طرز عمل سند ہے۔ یہ آزاد خیالی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ بھی مقلد ہی ہیں۔ جب تک قوم میں نئی زندگی اُبھرنے کے سامان پیدا نہ ہوں تب تک ہر طرف مقلد ہی مقلد نظر آئیں گے۔ اگر تقلید ہی کو شیوہ بنانا ہے تو پھر اپنے اسلاف کی تقلید اغیار کی تقلید سے بہتر ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ عہد حاضر کے فتنوں نے ہماری ملت کو اپنے جلوؤں سے چندھیا دیا ہے اور ہمارے باطن کی آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے:

جلوہ اش ما را ز ما بیگانہ کرد ساز ما را از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتش دیرینہ برد نور و نار لا الا از سینہ برد
مضمحل گردد چو تقویم حیات ملت از تقدیر نمی گیرد ثبات

ماضی کی معتقدانہ تقلید سے جوئے کم آب ہی ملے گی جو ہماری زندگی کو پوری طرح سیراب نہیں کر سکتی لیکن جب دریا ریگستان میں گم ہو گیا تو بچی کھچی چھوٹی سی نہر ہی کی حفاظت کریں:

بحر گم کردی زیاں اندیش باش حافظ جوئے کم آب خویش باش

تقلید کی یہ تلقین ایک مردہ قوم کے لیے ہے۔ اقبال ملت اسلامیہ کو دور حاضر میں مردہ ہی سمجھتا ہے، اگرچہ اس کے احیا سے نا اُمید نہیں۔ اب یہی بہتر ہے کہ اللہ اللہ کرو اور طرز فکر و عمل میں کسی گذشتہ امام کی تقلید ہی کر لو، لیکن یہ تقلید غذائے رُوح نہیں بلکہ مریض میں جو جان کی رمق باقی دکھائی دیتی ہے، اس کو

سنبھالنے کے لیے ایک دوا ہے:

اے پریشان محفل دیرینہ ات مرد شمع زندگی درسینہ ات
نقشِ بر دلِ معنی توحید کن چارہ کار خود از تقلید کن

یہ نصیحت عوام کے لیے ہے جن میں ہماری کم علم اور بے بصیرت علما کا ایک طبقہ بھی داخل ہے۔ الا ماشاءاللہ۔ اس نصیحت کو اقبال اپنے لیے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا اپنا ذوق تو یہ ہے کہ اجتہاد اور جدت وقدرت میں اگر غلطی بھی سرزد ہو تو وہ اس کو مقلدانہ نیکی پر ترجیح دیتا ہے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے ز بند پاستان آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوہ خوب پیمبرؐ ہم رہ اجداد رفتے

اتباع آئین کی تلقین پر ایک اور نظم ہے جس میں شریعت اسلام کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شریعت اور عشق دونوں کی ماہیت سے ناواقف لوگوں نے ان کو باہم برسر پیکار سمجھ لیا:

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

یہ بحث اسلام سے زیادہ قدیم ہے۔ موسوی شریعت رفتہ رفتہ اس قدر پیچ در پیچ اور زندگی کے لیے جنجال بن گئی اس کی تفصیلی پابندیوں میں رُوح دین غائب ہوگئی۔ حضرت مسیحؑ نے اس ظاہر پرستی اور شعائر پرستی کی شدت کے خلاف احتجاج کیا۔ یہودی علما نے ان پر مخالف شرع ہونے کا الزام لگایا اور ان کو مصلوب کرانے کے درپے ہوگئے۔ ہر چند کہ حضرت مسیحؑ کہتے رہے کہ میں شریعت کو منسوخ کرنے نہیں آیا بلکہ اس کی تکمیل کرنے آیا ہوں۔ میں تمھیں شریعت کے ظاہر کی نسبت اس کے باطن کی طرف متوجہ ہونے کی تعلیم دیتا ہوں۔ حضرت مسیحؑ کے بعد پولوس نے شریعت موسوی سے تنگ آکر یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ مسیحؑ کی آمد سے محبت نے شریعت کو منسوخ کر دیا ہے۔ عیسوی تاریخ میں اس کے اچھے نتائج نہ نکلے۔ کسی نہ کسی شریعت کی ضرورت تو زندگی کے لیے لابدی ہے۔ جب قسطنطین کے عیسائی ہونے سے مملکت غارنشیں راہبوں کے ہاتھ آگئی تو ان کو آئین وقوانین وضع کرنے پڑے اور مسیحؑ کی بجائے کلیسا شریعت گر ہوگیا۔

اسلامی شریعت کی نسبت اقبال کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلامی شریعت کے حقائق سے اچھی طرح آشنا ہو تو اس پر یہ حقیقت واضع ہو جائے گی کہ یہاں شریعت اور محبت میں کوئی تضاد نہیں اور شریعت کے ہر حکم کی تہ میں محبت محبت ہی کا جذبہ ہے:

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

اب ہمارے ہاں شریعت کے علم بردار اور مدعی ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کے فروغی مناقشات میں محبت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ غیر مسلموں اور عام انسانوں سے محبت تو درکنار اپنوں میں تفرقہ اندازی حامیان شریعت کا شیوہ بن گیا ہے۔ لعن وطعن اور تشنیع کا بازار گرم رہتا ہے۔ شریعت اسلامی کی اساس حکمت بھی ہے اور محبت بھی اور اس کا مقصد انسانوں کی قوتوں میں اضافہ کرنا ہے:

قدرت اندر علم او پیداستے ہم عصا و ہم ید بیضاستے

اگر مستحب کی ادائیگی میں کوئی شخص یا گروہ مزاحم ہو تو اس کو ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ دشمن اگر مطمئن اور جنگ کے لیے تیار نہ ہو تو اس کو بے خبر اور کمزور پا کر اس پر حملہ آور ہونا حرام ہے۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین نے یروشلم پر حملہ کرنے سے بیشتر دشمن کو پیغام بھیجا کہ اگر تم جنگ چاہو تو میں تم کو اپنی قوتوں کو مستحکم اور منظّم کرنے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں مہیا کروں گا، لیکن میں صلح کو اپنے لیے اور تمھارے لیے جنگ کے مقابلے میں بہتر سمجھتا ہوں۔ کمزور جانوروں کے شکار سے شکاری خود سست اور پست ہمت ہو جاتا ہے۔ دشمن کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا اُصولِ شجاعت کے خلاف ہے:

نیست میشے ناتوانے لاغرے درخور سر پنجہ شیر نرے
باز چوں با صعوہ خوگر می شود از شکار خود زبوں ترمی شود

اسلامی شریعت نے رہبانیت کو اس لیے مذموم قرار دیا کہ اسلام سراپا پیغام عمل ہے:

ہست دین مصطفیٰؐ دین حیات شرع او تفسیر آئین حیات
صیقلش آئینہ سازد سنگ را از دل آہن رباید زنگ را

مسلمانوں جب عجم میں پہنچے تو ذوق قوت نزاکت اور لطافت میں منتقل ہو گیا۔ شیرافگن مسلمان نوائے عندلیب سے بے تاب ہونے لگے، یارگ گل سے بلبل کے پر باندھنے لگے:

آ عندلیب مل کر کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پُکار میں چلاؤں ہائے دل
آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند گشت از پامال مورے درد مند
آنکہ از تکبیر او سنگ آب گشت از صفیر بلبلے بے تاب گشت

عجمی تصورات میں لطافت افکار بھی ہے اور پرواز تخیل بھی اور اس کے فن میں ذوق جمال بھی ہے، لیکن اسلام کی شریعت، بصیرت اور قوت سے اس کو لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔ بے چارے مرزا غالب نے صاف طور پر اقبال کیا کہ میں عجمی نہاد ہوں اس لیے دین عربی میرے دل و دماغ میں نہیں گھستا:

رموز دیں نشناسم عجب مدار زمن کہ دین من عربی نہاد من عجمی است

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ احمد رفاعیؒ نے اپنے ایک مرید کو نصیحت کی کہ عجمی افکار سے پرہیز کرنا:

با مریدے گفت اے جان پدر — از خیالات عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت — از حد دین نبی بیروں گذشت

ایک نظم میں اپنے بچپن کے ایک واقعے کو نظم کیا ہے کہ میں نے ایک سائل کو تنگ آ کر زدوکوب کی۔ والد صاحب کو جب معلوم ہوا تو اُنھوں نے عجب مؤثر انداز میں مجھے تنبیہ کی کہ اسلام تو شفقت برخلق کا نام ہے اور اس کا نبی رحمۃ للعالمینؐ ہے۔ جب روزِ محشر میں سب کے سامنے مجھ سے پوچھا جائے گا کہ اپنے بیٹے کی تو نے یہی تربیت کی تھی کہ وہ ایک سائل بےنوا کو مارے پیٹے تو میں کس قدر شرمند ہوں گا۔ قرآن وسنت رحمت وشفقت کی تعلیم ہے:

فطرت مسلم سراپا شفقت است — در جہاں دست و زبانش رحمت است

اقبال نے شمع وشاعر میں ایک شعر کہا تھا:

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات — یہ کبھی شبنم کبھی گوہر کبھی آنسو ہوا

اب اقبال یہ کہتا ہے کہ شبنم اور آنسو بننے سے بہتر ہے کہ قطرہ گوہر بن جائے، لیکن قطرہ آغوش تلاطم میں گوہر بنتا تھا، اس لیے شریعت اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مزاحمتوں اور خطروں پر غالب آ کر انسان اپنے نفس کو قوی بنائے:

قطرہ نیساں کہ مہجور از یم ست — نذرِ خاشاکے مثال شبنم است
طینت پاک مسلماں گوہر است — آب و تابش از یم پیغمبرؐ است

اس کے بعد ایک نظم میں اس خیال کی توضیح کی ہے کہ حیات ملیہ کے لیے کوئی مرکز محسوس بھی ہونا چاہیے۔ مسلمان کعبے کے سنگ وخشت کی پرستش نہیں کرتا، لیکن یہ مرکز محسوس شرق وغرب اور شمال وجنوب کے لاتعداد مسلمانوں کے لیے ایک نقطہ جاذب ہے جو حیات ملت میں ہم آہنگی اور وحدت کو ترقی دیتا ہے۔

پہلے زندگی کی ماہیت کے متعلق نہایت حکیمانہ اشعار کہے ہیں کہ حیات رم پیہم ہے، مادّہ ہو یا نفس اس میں مسلسل روانی اور تغیر احوال ہے۔ زندگی سراپا پرواز ہے، لیکن نشیمن بھی خود ہی بناتی ہے۔ عارضی طور پر سکون وجمود کی آفرینش کا مقصد بھی یہی ہے کہ ذوق خرام میں فزائش ہو:

پا بگل گردد حیات تیز گام — تا دو بالا گردش ذوق خرام
زندگی دو ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

(میر)

زندگی خود اپنے رشتے میں گرہیں ڈالتی ہے تاکہ گرہ کشائی کی لذت حاصل ہو:

دمبدم مشکل گر و آسان گزار دمبدم نو آفرین و تازہ کار

جس طرح حیات رواں کچھ عرصے کے لیے بدن میں اپنے آپ کو محدود کرتی ہے اسی طرح رُوح ملت کے لیے بھی ایک بدن کی ضرورت ہے۔ بیت الحرام اسی رُوح کا ایک مادّی مرکز و مسکن ہے۔ مختلف قومیں اپنے جھنڈوں کو اقتدار و وقار کا مرئی مرکز بنا لیتی ہے اور جنگ و صلح میں جھنڈے کے وقار کو قومی وقار کی علامت سمجھتی ہیں، حالانکہ مادّی حیثیت میں جھنڈا محض ایک لکڑی کا ٹکڑا اور دو چار گز کپڑا ہوتا ہے۔ بیت الحرام اپنی روایات کے لحاظ سے ان جھنڈوں سے بہتر مرکز عقیدت ہے:

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے
رازدار و راز ما بیت الحرام سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

امتیں جمعیت ہی سے قائم و اُستوار رہتی ہیں۔ بیت الحرام جمعیت میں ایک قومی معاون ہے۔ اُمت موسوی کی جمعیت اس لیے پریشان ہوئی کہ اس کا مرکز اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کا معبد منہدم ہو گیا جس کی باقی ماندہ ایک دیوار پر اس تمام دُنیا کے زائر یہودی سر ٹکرا کر گریہ وزاری کرتے ہیں۔ یہودیوں کی تاریخ سے ملت مسلمہ کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اپنی جان سے زیادہ اس مرکز کی حفاظت کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔ ایک روز علامہ مجھ سے فرمانے لگے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے علاوہ معبد کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور قرآن جو صلوٰۃ وسطیٰ کی خاص حفاظت پر زور دیتا ہے میرے نزدیک اس کے معنی بیت الحرام کی حفاظت ہیں۔ وہ معلوم نہیں کہ دیگر مفسرین کہاں تک علامہ کی اس تاویل سے متفق الرائے ہوں گے۔

لیکن کعبہ مسلمانوں کی نظرگاہ نہیں۔ مسلمانوں کا حقیقی نصب العین حفظ و نشر توحید ہے۔ تمام دین توحید کی تشریح ہے اور تمام عبادات و شعائر اسی کو قائم رکھنے کے ذرائع ہیں۔ توحید ہی ملت اسلامیہ کا امتیازی جوہر ہے اور توحید ہی اس کی جمعیت کی شیرازہ بند ہو سکتی ہے۔

زندگی کی حقیقت مقصد کوشی ہے۔ توحید و وحدت آفرینی سے زیادہ بلند اور کوئی مقصود نہیں ہو سکتا۔ تمام مقاصد اسی کے زیر نگیں ہونے چاہئیں۔ ادنیٰ مقاصد ادنیٰ وحدتیں پیدا کرتے ہیں، اعلیٰ ترین مقصد وسیع ترین وحدت حیات پیدا کر سکتا ہے:

چوں حیات از مقصدے محرم شود ضابط اسباب ایں عالم شود

راہ پیمائی کسی منزل ہی کی طرف ہو سکتی ہے۔ اگر منزل معین نہ ہو تو دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان جامد و ساکن ہو کر رہ جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ہرزہ گرد ہو جائے۔ ''بسکہ دراز اوفتد جادہ زگمراہیم'' (غالب)۔ قیس صحرا میں آوارہ دکھائی دیتا ہے لیکن وہ محمل لیلیٰ کی تلاش میں گرم رو ہے۔ جسم

انسانی کے اندر بھی بے انتہا اور گوناگوں اعمال و وظائف بقائے حیات کے واحد مقصود سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں:

گردش خونے کہ در رگ ہائے ماست تیز از سعی حصول مدعا ست

جس قدر کسی کا مقصد بلند ہوتا ہے، اسی قدر اس کی ہمت اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بقول شاعر:

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

جب کسی قوم میں شدید جدوجہد دکھائی دیتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی شاہدِ مقصود کی طرف دیوانہ وار بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مقصود کو ہر دم پیش رکھنا چاہیے۔ ایک قدیم صوفیانہ محاورہ ہے کہ جو دم غافل سو دم کافر۔ پاؤں کا کانٹا نکالنے کے لیے ایک مسافر کارواں سے ذرا الگ ہوا تنے میں محمل نظر سے اوجھل ہو گیا اور وہ سو سال تک صحرا میں اس کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہا:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

زندگی مقصد کی جستجو اور تگ و دو میں قرنہا سے تجربے کرتی چلی آ رہی ہے۔ کئی معبودانِ باطل بنائے اور پھر ان کو توڑ ڈالا، آخر کار اس پیکارِ حیات نے ارتقاء کی آخری منزل میں انسان کو توحید سے آشنا کیا جو منتہائے حیات ہے والیٰ ربك المنتهیٰ:

مدتے پیکار با احرار داشت با خداوندان باطل کار داشت
تخم ایماں آخر اندر گل نشاند با زبانت کلمہ توحید خواند

توحید کے عرفان ہی سے زندگی میں تمام جمال و جلال پیدا ہوتا ہے۔ اس سرچشمہ حیات کی حفاظت مقصودِ حیات ہے۔ جب تک تمام عالم پر یہ راز افشا نہ ہو تب تک مسلمان کو دم نہ لینا چاہیے:

زانکہ در تکبیر راز بود تست حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست
تا نہ خیزد بانگ حق از عالمے گر مسلمانی نیاسائی دمے

اسی عقیدے نے انسانوں کو توہمات سے پاک کیا ہے اور ہر قسم کے خوف کو اس کے دل سے دور کیا ہے۔ فکر انسانی بار بار بت گری اور بت پرستی کی طرف عود کرتا ہے۔ پہلے اصنام کو توڑتا ہے تو دوسرے اصنام تراش لیتا ہے۔ عصر حاضر میں فرنگ کی بدولت رنگ و ملک و نسب کی پرستش ہو رہی ہے اور خدا پر عقیدہ تو ہم پرستی شمار ہوتا ہے۔ ان بتوں کو توڑنے کے لیے پھر ایمان ابراہیمی اور توحیدِ محمدؐ کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان نے یہ کام نہ کیا تو اور کون کرے گا؟ اس عرفان کا جائزہ وارث تو وہی ہے، لیکن میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔ علامہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس خیال سے لرزہ آتا ہے کہ روزِ شمار میں جب خدا تم سے پوچھے گا کہ تمھیں پیغامِ حق دیا تھا کہ اسے دوسروں تک پہنچا دو، یہ کام تم لوگوں نے یوں نہ کیا، تو مسلمان کس قدر

شرمندہ اور ذلیل ہوگا۔ دوسروں تک پہنچانا تو درکنار یہاں اپنے اندر ہی سے توحید غائب ہوگئی ہے، کلمہ لا الٰہ زبان پر رہ گیا ہے، باقی سب کچھ یا شرک جلی ہے یا شرک خفی:

او خویشتن گم است کرا رہبری کنہ

اس کے بعد اقبال کا خاص موضوع آتا ہے کہ عالم کی قوتوں کی تسخیر کے بغیر حیات ملی میں وسعت اور قوت پیدا نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے آدم کو مسجود ملائک اور مسخر کائنات بنایا تا کہ تمام ارضی اور سماوی، مادی اور روحانی قوتوں کی تسخیر سے وہ نائب الٰہی بن سکے۔ رہبانیت نفسی احوال میں مبتلا ہوگئی اور حکمت فرنگ نے تمام قوتیں تسخیر عالم محسوس میں صرف کر دیں۔ دونوں طریقوں سے زندگی کی تکمیل نہ ہوسکی۔ ہستی کا ظاہر اور باطن دونوں حیاتِ الٰہی کا انکشاف ہیں۔ ھو الظاھر ھو الباطن حاضر کو غیب کے حقائق کے مطابق ڈھالنا اور دُنیا کو دین بنانا مقصود اسلام اور غایت حیات ہے۔ 'با آسمان پر داختن' کے ساتھ ساتھ 'کار زمین رانکو ساختن' کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔ فقط بانا دیدہ پیمان بستن سے حیات گریز رہبانیت ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ ہندومت، بدھ مت اور عیسائیت کی ابتدا میں ایسا ہی ہوا۔ اسلام نے حاضر کا پیوند غیب سے لگایا اور انفس و آفاق کو ہم آغوش کرنے کی تلقین کی۔ ماسوا نہ فریب ادراک ہے اور نہ حقیقت ابدی ہے۔ اس کی آفرینش کا مقصود ہی یہی ہے کہ اس کی تسخیر سے نفس ترقی کریں:

اے کہ با نادیدہ پیمان بستہ ای ہمچو سیل از قید ساحل رستہ ای
چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز دل بغائب بند و با حاضر ستیز
ہستی حاضر کند تفسیر غیب می شود دیباچہ تسخیر غیب
ماسوا از بہر تسخیر است و بس سینہ او عرضہ تیر است و بس

ملت اسلامیہ کے انحطاط کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ فرنگ تسخیر آفاق میں لگا رہا اور اس کی بدولت غیر معمولی قوتیں پیدا کر لیں، مگر مسلمان فقط بے حضور نمازیں پڑھتے رہے یا ظواہر و شعائر کی پابندی میں لگے رہے۔ قرآن نے مشاہدہ کائنات کو عبادت قرار دیا تھا، مسلمان قرآنی آیات کی تلاوت کرتے رہے لیکن عمل دوسروں نے کیا۔ جن قوموں نے خارجی فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا اُنھوں نے مسلمانوں کو بھی آ دبوچا۔ مسلمان بے بس اور مغلوب ہو کر خدا سے شکوہ کرنے لگے کہ یہ کیا بات ہے کہ دوسری امتیں تیرا نام بھی نہیں لیتیں اور باوقار ہیں۔ توحید کی امانت ہمارے سینوں میں ہے لیکن ہم ہی ذلیل ہیں:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
(غالب)

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں عجز والے بھی ہیں مست مے پندار بھی ہیں

ان میں کامل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں سینکڑوں ہیں جو ترے نام سے بیزار بھی ہے
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اس کا جواب خدا نے یہی دیا کہ تمھاری شکایت بے بنیاد ہے۔ کافر کو جو کچھ ملا وہ کفر کا اجر نہیں بلکہ کافر کی زندگی میں اسلامی عناصر کی جزا ہے:

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

ابھی تک کثرت سے مسلمان اس وہم میں مبتلا ہیں کہ فرنگ مادّہ پرست ہے اور اس کی تمام ترقی مادّی ہے۔ روحانیت اور نجات کے اجارہ دار ہم ہی ہیں۔ یہ چند روزہ دُنیا کا عیش کافروں کے لیے ہے، ابدالا باد تک رہنے والی جنت کے ہم حقدار ہیں۔ قرآن نے کیا خوب کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ بھی روحانی اور اخلاقی تنگ نظری سے اسی قسم کے دعوے کیا کرتے تھے:

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرۂ تعمیر کرد
عقدہ محسوس را اوّل کشود ہمت از تسخیر موجود آزمود
کوہ و صحرا دست و دریا بحر و بر تختۂ تعلیم ارباب نظر

لیکن مسلمانوں کے لیے مذہب افیون بن گیا، دُنیا اعتنا کے قابل نہ رہی۔ خدا نے فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة کی دُعا سکھائی تھی اور اس دُعا میں دُنیا کو درست کرنا آخرت پر مقدم رکھا تھا اس لیے کہ دُنیا ہی مزرعہ آخرت ہے۔ اگر کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہے تو اس کی فردا میں ناکردہ کار کو کیا ثمر ملے گا؟ مسلمان نے آخرت پر نظر جمائے ہوئے دُنیا کو کفار کے حوالے کر دیا:

اے کہ از تاثیر افیون خفتہ عالم اسباب را دوں گفتہ
خیز و واکن دیدہ مخمور را دوں مخواں ایں عالم مجبور را
غایتش توسیع ذات مسلم است امتحان ممکنات مسلم است

اگر ملت اسلامیہ آفاقی قوتوں کو مسخر نہ کر سکے گی تو آفاقی قوتوں کی تسخیر سے غیر مسلم اقوام اس کو مغلوب کر لیں گی:

گیر اور را تا نہ او گیرد ترا ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

زندگی میں حاجات اندیشہ و عمل کے توسن کے لیے تازیانہ ہیں۔ آدم کو عناصر پر حاکم بنایا گیا تھا۔ اگر وہ عناصر کی ماہیت سے آشنا نہ ہو اور ان سے کام نہ لے سکے، تو وہ نیابت الٰہی کا کیا حق ادا کرے گا:

تا ز تسخیر قوائے ایں نظام ذو فنونیہائے تو گردد تمام
نائب حق در جہاں آدم شود بر عناصر حکم او محکم شود

اسی ظاہری فضا میں کئی عالم پوشیدہ ہیں۔ ہر ذرّے کے اندر ایک خورشید کی قوت پنہاں ہے۔ اسرار موجودات کی گرہ کشائی سے بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے اور قوت بھی۔ باد و باراں اور برق و رعد مطیع و فرماں بردار ہوتے ہیں۔ سیلابوں میں بجلیاں ظہور کے لیے بے تاب ہیں۔ اقوام کہن ستاروں کی پرستش کرتی تھیں لیکن حکمت کی ترقی نے انسان کے ادراک کو ان پر محیط کر دیا:

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن

عرفان و حکمت اشیا کی بدولت ناتواں قومیں غیر معمولی قوت حاصل کر کے بڑی بڑی جابر قوموں کی گردن مروڑ دیتی ہیں۔ شجاعت بے حکمت دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور اقوام حکیم کی باج گزار ہو جاتی ہیں:

تا نصیب از حکمت اشیا برد ناتواں باج از توانایاں خورد

خدا نے مجھے بار بار تاکید کی کہ فطرت کو غور سے دیکھ۔ نباتات، حیوانات، جمادات سب سے آئین الٰہی تلاش کر۔ تو فقط "انظر" والی آیات ہی دہراتا رہا۔ دیکھا دکھایا کچھ نہیں۔ قرآن حکیم فقط تلاوت کے لیے تو نہ تھا، اس کا اصل مقصود صحیفہ فطرت کے مطالعے سے حقائق الٰہیہ کا اخذ کرنا تھا۔ تو نے مشاہدہ کائنات کو کوئی عبادت ہی نہ سمجھا اور اسے دُنیائے دوں کا ایک شغل قرار دیا ہے۔ اب اس کی سزا بھگت رہا ہے:

تو کہ مقصود خطاب "انظری" پس چرا ایں راہ چوں کوران بری

سیّد احمد خان اور مرزا غالب، جن کے انداز فکر، طرز زندگی اور مقصود حیات میں بے حد تفاوت نظر آتا ہے، ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کو محض ایک عسکری کامیابی کا نتیجہ نہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں کی بالغ نظری پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ یہ نئی حکمران قوم محض تاجر اور کشور کشا نہیں بلکہ طبعی سائنس کی بدولت فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے بے بصر اقوام پر غالب آ گئی ہے۔ اب مشرقیوں کو ان سے کچھ سیکھنا ہے۔ سیّد احمد خان کو لوگ قابل اعتراض حد تک مداح و مقلد فرنگ سمجھتے تھے لیکن مرزا غالب کی ترقی پسند کی یہ کیفیت تھی کہ جب سیّد صاحب نے آئین اکبری کو تصحیح اور حواشی کے ساتھ پسندیدہ انداز میں شائع کیا اور مرزا غالب کو تقریظ کے لیے یہ کتاب بھیجی تو مرزا صاحب اس قدر برہم ہوئے کہ سیّد صاحب سے قدیم دوستی بھی مخالفانہ تنقید پر غالب نہ آ سکی۔ تعریف کی بجائے اس تقریظ میں، جو غالب کے کلیات فارسی میں شامل ہے، وہ سیّد صاحب کے اس کارنامے پر افسوس کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ 'مردہ پروری' تو عقلمندوں کا کام نہیں۔ یہ پُرانے آئین اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔ 'زمانہ دگر گونہ آئین نہاد' اب اس حکمت اور اس قانون پر غور کرو جو حکمت پسند ملت فرنگ اپنے ساتھ لائی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس قوم نے فہم فطرت سے تسخیر فطرت کا کام کیا ہے۔ الفاظ ہوا میں اُڑا کر دور دراز مقامات تک پیغام پہنچا دیتے ہیں۔ اس قوم نے حروف

کو پیامبر کبوتر بنا دیا ہے اور ان کے ساز دیکھو کہ بے زخمہ مضراب بجتے ہیں تسخیر فطرت کے مضمون میں علامہ اقبال نے مرزا غالب کے حوالے سے دو چار اشعار لکھے ہیں۔ غالب کے اشعار میں ایک یہ شعر تھا:

حرف چوں طائر بہ پرواز آورند　　　　نغمہ را بے زخمہ از ساز آورند

علامہ فرماتے ہیں:

آنکہ بر اشیا کمند انداخت است　　　　مرکب از برق وحرارت ساخت است
حرف چوں طائر بہ پرواز آورد　　　　نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد

سیّد صاحب جب اپنے دو بیٹوں حامد و محمود کو لے کر انگلستان گئے تو وہاں ہر طبقے میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئر نے بھی ان کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا جس میں زیادہ تر ماہر انجینئر ز ہی مدعو تھے۔ سیّد صاحب کو وہاں کچھ تقریر کرنا پڑی اس تقریر میں سیّد صاحب نے کہا کہ تمہاری قوم کو اپلائڈ سائنس اور انجینئر نگ کی بدولت عروج اور غلبہ حاصل ہوا ہے۔ برق اور بھاپ سے کام لینے والے اور ریلیں، تلغراف اور پل بنانے والوں نے تمہاری سلطنت کو قوت بخشی ہے۔ اپنے وطن میں سیّد صاحب کی کوششوں کا محور بھی یہی تصور تھا کہ اسلام بھی مسلمانوں سے یہی تقاضا کرتا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ اس سے غافل ہو کر ضعیف اور مغلوب ہو گئے۔ عقائد و اخلاق کو مغرب سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں، اس کا قیمتی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، لیکن تسخیر فطرت سے روگردانی کی وجہ سے یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ زندگی کی دوڑ میں ہم لنگڑے بن گئے ہیں۔ حکمت آشنا سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے ہم اس آدم کے وارث نہیں رہے جس کی نسبت قرآن نے علم آدم الاسما کہا تھا۔ یہ اسما محض نام اور الفاظ نہ تھے بلکہ صفات اشیا و حوادث کا علم تھے۔ جن اقوام نے اس حقیقت کو پالیا وہ ہم سے آگے نکل گئیں اور ہم پسماندہ قوم رہ گئے:

اے خرت لنگ از رہ دشوار زیست　　　　غافل از ہنگامۂ پیکار زیست
ہمر ہانت پے بہ منزل بردہ اند　　　　لیلیٰ معنی ز محمل بردہ اند
تو بصحرا مثل قیس آوارہ　　　　خستہ واماندہ بیچارہ
علم اسما اعتبار آدم است　　　　حکمت اشیا حصار آدم است

اقبال فرنگ کی سائنس اور اس سے پیدا شدہ تسخیر فطرت کا مخالف نہیں، وہ جس حکمت فرنگ کے خلاف احتجاج کرتا ہے وہ مادّیت کا نظریہ حیات ہے جو خارجی فطرت کے ایک غلط تصور سے پیدا ہوا۔ خود فرنگ کے اکابر حکماء اور سائنس دان اس فلسفے پر ویسی ہی تقلید کرتے ہیں جو اقبال کے کلام میں ملتی ہے اور اپنے انگریزی خطبات میں اقبال نے زیادہ تر انھیں حکمائے فرنگ کی بالگ نظر کے نمونے پیش کیے ہیں۔

اس کے بعد رموزِ بیخودی میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جس طرح تکمیل ذاتِ کے لیے فرد کو احساس

خودی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح ملت کی بھی ایک خودی ہے جو افراد کی خودی سے وسیع تر اور قوی تر ہے۔ اس کی تکمیل بھی لازمی ہے اور یہ تکمیل تسخیر فطرت کے علاوہ ضبط روایات ملیہ ہی سے ہوسکتی ہے۔ پہلے کچھ اشعار میں یہ بتایا ہے کہ فرد کی خودی کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ بچہ اپنی حقیقت سے کچھ واقف نہیں ہوتا، اس کا کام کھانا سونا اور بات کرنا سیکھنے کے بعد ہر چیز کے متعلق سوالات کرنا ہے، یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ اور یہ کیسے ہے؟ ان سوالات کی کثرت سے ماں باپ زچ آجاتے ہیں۔ زندگی کا یہی آئین ہے۔ پہلے تمام توجہ خود پر مبذول ہوتی ہے اور اپنے 'من' کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ کسی قدر فہم ماسوا کے بعد بچے میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں 'میں' ہوں تمام دیگر نفوس اور اشیا سے الگ ایک ہستی رکھتا ہوں، ماضی حال اور مستقبل سب اس 'میں' کی لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ مسلسل جسمانی تغیرات اور بدنی نشوونما کے باوجود وہ اپنی خودی کو ایک غیر متغیر اور مستقل چیز سمجھتا ہے:

یاد او با خود شناسایش کند — حفظ ربط دوش و فردایش کند
گرچہ ہر دم کاہد افزاید گلش — من ہمانستم کہ بودم در دلش
ایں 'من' نوازادہ آغاز حیات — نغمہ بیداری ساز حیات

ملت نوزائیدہ بھی کمسن بچے کی طرح ہوتی ہے، اس کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے اور نہ اسے مستقبل کا کوئی واضح احساس ہوتا ہے۔ دیروز وامروز وفردا کا شیرازہ بند 'انا' ابھی اس میں نہیں ہوتا، 'بستہ با امروز او فرداش نیست'، اس کی ہستی جسمانی آنکھ کے مماثل ہوتی ہے جو ہر شے کو دیکھتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی:

چشم ہستی را مثال مردم است — غیر را بیننده و او خود گم است

جب کوئی ملت حوادث وافکار کی پیکار میں کچھ عرصہ بسر کرچکتی ہے تو اس کے اندر ایک 'ملی انا' کا شعور ترقی کرتا ہے۔ قوم اپنی سرگزشت سے افکار وتاثرات کی ثروت حاصل کرتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے ماضی کو فراموش کردے یا کوتاہ بینی سے عملاً اپنا رشتہ اس سے منقطع کرلے تو وہ نابود ہوجاتی ہے:

سر گزشت او گر از یادش رود — باز اندر نیستی گم می شود

حفظ روایت کی سوزن سے ربط ایام کا پیرہن تیار ہوتا ہے جو ناموس ملت کا محافظ بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے باعث تزئین بھی۔ نافہم لوگ تاریخ کو محض پُرانی داستانیں سمجھتے ہیں اور هذا اساطیر الاوّلین کہہ کر اس کی حقیقت سے غافل رہتے ہیں۔ تاریخ تو ایک ملت کا حافظہ ہے، فردمید سے حافظہ غائب ہوجائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ قوم بھی اگر اپنی تاریخ سے غافل ہوجائے تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔

تاریخ ایک ساز ہے جس کے تاروں میں تمام نغمہ ہائے رفتہ اسیر ہوتے ہیں۔ صدیوں کی پُرانی شراب اس کے خم ومینا میں ہوتی ہے، اس کی کہنگی مستی میں اضافہ کرتی ہے:

بادۂ صد سالہ در مینائے او مستی پارینہ در صہبائے او

زندہ قوموں کو دیکھو کہ کمال جدت پسندی کے ساتھ ساتھ اپنی روایات کے متعلق کس قدر قدامت پرست ہوتی ہیں۔ دوش و امروز کا پیوند نفس ملت میں لذت اور قوت پیدا کرتا ہے۔ ہر قوم کا حال اس کے ماضی کی پیداوار ہے اور اس کا مستقبل اس کے ماضی و حال کا نتیجہ ہوگا۔ یہ وسعت زمانی اور ہزار سالہ حوادث کی حافظے میں یکجائی حیات ملی کی کفیل ہوتی ہے:

سر زند از ماضی تو حال تو خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لازوال رشتہ ماضی ز استقبال و حال

لیکن قومی روایات کی حفاظت اس انداز کی نہیں ہونی چاہیے کہ ملت ماضی پرست ہو کہ جامد ہو جائے اور زندگی کے ہر نئے اقدام کو یہ کہہ کر ٹھکرا دے کہ ہمارے قدیم عقائد و اعمال ہمارے لیے کافی ہیں۔ ماوجدنا علیه آبائنا ہر نبی کے مخالفوں نے یہی راگ الاپا۔ قرآن نے اس روایت پرستی کی شدید مذمت کی ہے اور تاریخ سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ اقبال جیسے جدت پسند اور انقلاب آفریں انسان کے ہاں حفظ روایات کا کوئی جامد مفہوم نہیں ہے۔ زندگی اپنے کسی انداز کو جوں کا توں نہیں دہراتی۔ ماضی سے صحت مندانہ ربط حیات آفرین ہوتا ہے لیکن ماضی کی مقلدانہ پرستش حیات ملی کو جامد کر دیتی ہے۔

غیر مسلم اور متعصب مخالفین اسلام نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اسلام نے عورت کو بہت ادنیٰ مرتبہ دیا ہے۔ اس اعتراض کا نشانہ مسلمان اس لیے بنے کہ اُنھوں نے اپنی معاشرت میں اسلام سے بیگانہ ہوتے ہوئے عورتوں کو رسوم و رواج اور مردانہ خودغرضی کے پیدا کردہ غلط آئین کی بدولت بہت کچھ بے بس بنا دیا۔ اسلام نے جو حقوق عورتوں کو عطا کیے تھے۔ مسلمانوں نے رفتہ رفتہ ان کو سلب کر لیا اور ان نادانوں اور ہوس پرستوں کی وجہ سے اسلام بدنام ہو گیا۔ اسلام میں عورت اور ماں کا جو رتبہ ہے اس پر اقبال نے رموزِ بیخودی میں ایک بلیغ نظم لکھی ہے۔

خدا نے مرد و زن کو ایک دوسرے کا لباس بنایا، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر اقدار حیات کے لباس سے عریاں ہو جاتا ہے۔ عشق حق کا آغاز ماں کی محبت سے ہوتا ہے:

عشق حق پروردہ آغوش او

رسول کریم ﷺ نے خوشبو، نماز اور عورت کی مثلث مقدس کو اس دُنیا کی پسندیدہ چیزیں قرار دیا ہے۔ یہ تینوں جسمانی اور روحانی لطافتوں کا جوہر ہیں۔ جس مسلمان نے عورت کو محض اپنا پرستار اور اپنے ادنیٰ اغراض کا تختۂ مشق سمجھ لیا وہ قرآن کی حکمت سے بے بہرہ رہا:

مسلمے کو را پرستارے شمرد بہرہ از حکمت قرآن نہ برد

اسلام نے جنت کا مقام ماں کے قدموں کے نیچے قرار دیا۔ اُمت اور امومت میں گہرا معنوی ربط ہے۔ نبی کی شفقت اپنی اُمت پر بھی مادرانہ شفقت ہوتی ہے۔ سیرت اقوام انبیا کی تعلیم اور مثال سے بنی ہے یا اچھی ماؤں کی شفقت اور تربیت سے:

شفقت او شفقت پیغمبر است سیرت اقوام را صورتگر است
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے حرف اُمت رازہا دارد بسے

انسانی روابط میں محبت کا رشتہ قائم کرنے کے لیے قرآن تکریم ارحام کی تعلیم دیتا ہے۔ انسانی زندگی میں امومت کا یہ مقام ہے کہ اگر کوئی بے علم ماں جو ظاہری حسن و جمال نہ رکھتی ہو، سادہ اور کم زبان ہو لیکن ایک غیور مسلمان حق پرست اس کے بطن سے پیدا ہو اور اس کی آغوش میں پرورش پائے تو بقا و احیائے ملت کے لیے ایک اتنا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ بڑے بڑے تعمیری کام اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں جن پر مرد فخر کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی نازک اندام، پری و بعض مغربی عورتوں کی تقلید میں تہی آغوش رہے اور بار امومت کو اپنے لیے بار خاطر سمجھے تو اسے عورت نہیں کہنا چاہیے۔ ایسی عورت انسانیت کے لیے باعث شرم ہے حیانا آشنا آزادی ملت کشی کا سامان ہے۔ بے شمار ارواح جو وجود پذیر ہونے کے لیے مضطرب ہیں وہ امہات کی بدولت عالم ممکنات سے عالم وجود میں آتی ہیں۔ کسی قوم کا سرمایۂ نقد و قماش وسیم وزر نہیں بلکہ اچھے انسان ہیں جو خیابان ریاض مادر سے گل و لالہ کی طرح چمن افروز ہستی ہوتے ہیں۔

جس قوم میں عورتوں کی زندگی احترام سے محروم ہے وہاں مردوں کو بھی حیات صالح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ کسی قوم کی تہذیب کو جانچنے کا صحیح معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس میں عورت کا کیا مقام ہے، اگر عورت ذلیل ہے تو قوم بھی ذلیل اور تہذیب سے عاری ہے:

بردمد ایں لالہ زار ممکنات از خیابان ریاض امہات
قوم را سرمایہ اے صاحب نیست از نقد و قماش وسیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست
حافظ رمز اخوت مادراں قوت قرآن و ملت مادراں

مسلمان عورتوں کے لیے اسوہ کاملہ سیّدہ النسا فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ عیسوی دُنیا مریم طاہرہ و صدیقہ کی پرستش کرتی ہے، مسلمانوں کے دلوں میں بھی حضرت مریم کا بڑا احترام ہے اور یہ فقط اس نسبت سے ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہیں اور ان کی عفت کا خدا شاہد ہے۔ لیکن فاطمۃ الزہرا تین بلند پایہ نسبتوں کا مرکز ہیں، ایک عظیم المرتبت نبیؐ کی بیٹی، علیؓ جیسے جلیل القدر انسان کی بیوی اور امام الشہدا حضرت امام

حسینؓ کی ماں۔ تمام دُنیا کی تاریخ کوٹٹولیے اور قسم کی تین نسبتیں ایک عورت میں کبھی جمع نہ پاؤ گے۔ حضرت امام حسینؓ کی حریت آموز سیرت کا سرچشمہ اخلاق پدر بھی ہے اور اخلاق مادر بھی لیکن ماں کی سیرت فرزند میں زیادہ موثر ہوتی ہے اس لیے کہ بیداری شعور سے پہلے اس کے اثرات تحت الشعور میں مرتسم ہو جاتے ہیں:

سیرت فرزند ہا از امہات　　　جوہر صدق و صفا از امہات

فاطمۃ الزہرا ایک یہودی محتاج کی مدد کے لیے اپنی چادر فروخت کر ڈالتی ہیں، عرب کے بادشاہ کی بیٹی ہیں لیکن کوئی خدمت گار نہیں۔ قرآن کی آیات دہرائی ہوئی چکی پیستی رہتی ہیں:

آں ادب پروردہ صبر و رضا　　　آسیا گردان و لب قرآن سرا

رشتہ آئین حق زنجیر پاست　　　پاس فرمان جناب مصطفیٰؐ ست

ورنہ گرد تربتش گردیدمے　　　سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

اس کے بعد مسلمان عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال ان کو دورِ حاضر کے فتنوں سے آگاہ کرتا ہے جو عورت کی طینت پاک کی تخریب کے درپے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تقلید فرنگ پر مسلمان عورت دین و اخلاق سے کنارہ کش ہو کر جھوٹی آزادی کے چسکے میں اپنی پاکیزہ فطرت کو خیر باد کہہ دے:

دور حاضر تر فروش و پر فن است　　　کاروانش نقد دیں را رہزن است

کور و یزداں ناشناس ادراک او　　　ناکساں زنجیری پیچاک او

ہوشیار از دستبرد روزگار　　　گیر فرزندان خود را در کنار

نسوانی فطرت میں خدا نے بلند جذبات رکھے ہیں، ان کی حفاظت فاطمۃ الزہرا کے نمونے پر زندگی بسر کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اگر اس فطرت کو پاک رکھا گیا تو حسینؓ من انسان آغوش مادر میں تربیت حاصل کر سکتے ہیں:

تا حسینے شاخ تو بار آورد　　　موسم پیشیں بگلزار آورد

سورۂ اخلاص توحید کی تعلیم کا لب لباب ہے۔ قرآنی فصاحت کا کمال ہے کہ چار مختصر جملوں نے توحید کے قلزم ذخار کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ تمام قرآن توحید ہی کی تشریح ہے اور تمام حکمت بھی توحید ہی کے اندر پنہاں ہے۔ دین کی اصل توحید ہے باقی جو کچھ ہے وہ اس کی فرع ہے اس لیے مثنوی رموزِ بیخودی کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے سورۂ اخلاص ہی کی مختصر مگر بلیغ شرح لکھی ہے۔

فرماتے ہیں کہ مجھے خواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دیدار نصیب ہوا، میں نے عرض کیا کہ آپ نے اسلام کی اساس کو پختہ کرنے میں غیر معمولی بصیرت و ہمت و ایثار سے کام لیا، اب اس ملت کی بنیادیں

متزلزل ہو رہی ہیں، اس تعمیر کو سنبھالنے کے لیے کوئی علاج تجویز فرمایے:

پختہ از دستت اساس کارِ ما چارۂ فرما پے آزارِ ما

اس کا جواب یہ ملا کہ مسلمان اس توحید سے بیگانہ ہو گئے جو وحدت آفرین تھی۔ اسلام نے نسلی اور قبائلی امتیازات کو مٹا کر ایک ملت بنائی تھی لیکن اب تمہارا یہ حال ہے کہ تم پھر قبائل پرستی پر اُتر آئے ہو۔ گویا اسلام سے قبل کے زمانہ جاہلیت کی طرف عود کر آئے ہو جس میں سب سے زیادہ مؤثر جذبہ قبیلوی عصبیت تھا:

خویشتن را ترک و افغان خواندۂ وائے بر تو آنچہ بودی ماندہ

باز کی ساز از دوئی بردار رخت وحدت خود را مگرداں لخت لخت

زبان سے وحدت کا کلمہ پڑھتے ہو اور عمل سے ملتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہو۔ توحید اگر وحدت ملت میں مشہود نہ ہوئی تو وہ محض ایک لفظ بے معنی رہ گئی۔ جو ایمان عمل میں منعکس نہ ہو وہ ایمان ہی مردہ ہے:

صد ملل از ملتے انگیختی بر حصار خود شبخون ریختی

یک شو و توحید را مشہود کن غائبش را از عمل موجود کن

لذت ایمان فزاید در عمل مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

اللّٰہ الصمد

صمد کے معنی ہیں وہ ہستی جو کسی غیر اور ماسوا کی محتاج نہ ہو مگر تمام مخلوقات و موجودات اپنے وجود کے لیے اس کے محتاج ہوں۔ تخلقوا باخلاق اللہ کی تعلیم کے مطابق مسلمان کو بھی اپنے اندر یہ بے نیازی کی صفت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انسان کو حاجات کا شکار نہیں ہونا چاہیے، احتیاج انسان کے نفس کو کمزور کر دیتی ہے اور تمام قوت و محبت اور ایثار کو سلب کر لیتی ہے۔ بے نیازی مال و جاہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ ''آنانکہ غنی تر اند محتاج تر اند'' یہ طبیعت کا ایک انداز ہے جو نادار کو قارون پر فضیلت بخشتا ہے۔ اسی بے نیازی کی بدولت انسان راست باز ہوتا ہے، خوددار ہوتا ہے اور نشتر 'لا و نعم' اس کے سینے میں نہیں چبھتا۔ دُنیا عالم اسباب ہے لیکن انسان کو بندہ اسباب نہیں بننا چاہیے:

بندہ حق بندۂ اسباب نیست زندگانی گردش دولاب نیست

مسلم استی بے نیاز از غیر شو اہل عالم را سراپا خیر شو

رزق کے لیے دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنا خودی کو سوخت کر دیتا ہے۔ دانا مسافر کو جب دشوار گزار راستوں سے دور دراز کا سفر درپیش ہوتا ہے تو اشد ضروری چیزوں کے علاوہ فالتو سامان اپنے اُوپر

نہیں لادتا۔ سفر زندگی میں بھی فروانی سامان سے آسائش کی کوشش نہ کرو، یہ سامان تمہارے لیے گلے کا طوق اور زنجیر پا ہو جائے گا۔ فراوانی کی کوشش تم کو حقیر انسانوں کے سامنے نیاز مند بنا دے گی:

گرچہ باشی مور و ہم بے بال و پر حاجتے پیش سلیمانے مبر
راہ دشوار است سامان کم بگیر در جہاں آزاد زی آزاد میر

حکیم سقراط کا بھی ایک قول مشہور ہے کہ کم احتیاج انسان الوہیت کے صفات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے کیوں کہ خدا بھی بے احتیاج ہونے کی وجہ سے بے نیاز ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی یہی نصیحت فرماتے تھے اور اس کا بہترین نمونہ خود تھے: اقلل من الدنیا تعش حرا۔ دُنیاوی حاجتوں کو کم سے کم کرو، آزادی اور حریت کی زندگی اسی طرز عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ مردِ حُر کو فقط اتنے ہی مال کی ضرورت ہے جو اس کو سائل اور گداگر ہونے سے محفوظ رکھے۔ مال کا مصرف یا خدمت خلق ہے یا اپنی خود داری کی حفاظت مگر مال کی محبت کے بغیر منعم ہونا سائل ہونے سے بہتر ہے:

تا توانی کیمیا شو گل مشو در جہاں منعم شو و سائل مشو

بے نیازوں کی جائز ضرورتیں پورا کرنے کا مشیت الٰہی میں ایک پنہاں قانون موجود ہے:

خود بخود گردد درمیخانہ باز برتہی پیمانگان بے نیاز

رسول کریم ﷺ سے زیادہ مال سے بے نیاز شخص کون ہوگا لیکن خدا نے ان کی ہر ضرورت بڑی ہو یا چھوٹی، بے منت غیرے ہمیشہ پوری کی۔ جو شخص چاہے کاہلانہ بے پروائی نہیں بلکہ عارفانہ بے نیازی کو شیوہ بنا کر اس کو اپنی زندگی میں آزما کر دیکھ لے۔ یہاں بوعلی قلندر کا ایک شعر علامہ اقبال نے نقل کیا ہے:

پشت پا زن تخت کیکاؤس را سربدہ از کف مدہ ناموس را
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خلیفہ ہارون الرشید کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ اس نے امام مالک سے درخواست کی کہ دارالخلافت بغداد میں آ کر اپنی مسند بچھایے، یہاں بڑی رونق اور زندگی کی گہما گہمی ہے۔ یہاں ہر قسم کی قدردانی ہوگی۔ اس مرد خوددار اور عاشق رسولؐ نے مدینے سے ہلنا گوارا نہ کیا۔ فرمایا کہ میں یہاں بندۂ آزاد ہوں اور میرا سر آستانہ رسولؐ پر ہے۔ عشق خدا و رسولؐ مجھے کہتا ہے کہ تو بادشاہوں کو اپنا خدمت گزار بھی نہ بنا، چہ جائیکہ میں بادشاہوں کا ملازم ہو جاؤں۔ اگر علم دین کا شوق ہے تو یہی مدینے میں تشریف لایئے، پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا:

تو ہمی خواہی مرا آقا شوی بندہ آزاد را مولا شوی
بہر تعلیم تو آیم بر درت خادم ملت نگردد چاکرت

بہرہ خواہی اگر از علم دین　　　درمیان حلقہ درسم نشیں
بے نیازی رنگ حق پوشیدن است　　　رنگ غیر از پیرہن شوئیدن است

اے مسلمان تیری ذلت کا سبب یہی ہے کہ تجھ میں خودداری کا فقدان ہے۔ اغیار کے علوم پڑھتے ہو اور مقلدانہ فطرت کی وجہ سے ہر خیال کو بے چون و چرا قبول کر لیتے ہو۔ اغیار کے شعار سے ارجمند ہونا چاہتے ہو۔ تمہاری عقل افکار غیر سے پا بہ زنجیر ہے تمہاری زبان پر جو باتیں ہیں وہ تمہارے اپنے دل و دماغ کی پیداوار نہیں، تمہاری آرزوئیں بھی دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہیں:

بر زبانت گفتگوہا مستعار　　　در دل تو آرزو ہا مستعار

اے مسلمان تو اپنے نبیؐ کا فرمان بھول گیا ہے جو شخص دوسری اقوام سے مشابہت پیدا کرتا ہے وہ انہیں میں سے ہو جاتا ہے اور ملت اسلامیہ کا فرد نہیں رہتا:

لست منی گویدت مولائے ما　　　خاک بردی کیمیا درباختی
فرد فرد آمد کہ خود را وا شناخت　　　قوم قوم آمد کہ جز با خود نساخت

لم یلد و لم یولد

خدا کے ہاں صلبی پیدائش کا کوئی سوال نہیں، علامہ فرماتے ہیں کہ مرد موحد خدا کی اس صفت سے بھی ایک سبق حاصل کر سکتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے تو ہر انسان کسی کا بیٹا اور کسی کا باپ ہے لیکن یہ جسمانی ولدیت بہت ثانوی چیز ہے۔ حضرت سلمان فارسی سے لوگوں نے ان کا شجرہ نسب پوچھا تو اُنھوں نے جواب دیا ''سلمان ابن اسلام''۔ مسلمان کی اصل نسبت اسلام سے ہے، اب وام سے نہیں۔ توحید پر ایمان لانے سے ایمان کی کیفیت شہید کی سی ہو جاتی ہے جس میں ہزاروں پھولوں کا رس اس طرح آمیختہ ہے کہ کوئی قطرہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری اصل لالہ ہے یا گلاب یا نرگس۔ لم یلد و لم یولد کا پرتو اگر مومن کی زندگی پر پڑے تو اس کے احساس ملی میں نسب کوئی مقام نہ ہو:

قوم تو از رنگ و خوں بالا تر است　　　قیمت یک اسودش صد احمر است
قطرہ آب وضوے قنبرے　　　در بہا بر تر ز خون قیصرے
گر نسب را جزو ملت کردہ　　　رخنہ درکار اخوت کردہ

مسلمان کا نہ کوئی وطن ہے اور نہ کوئی رشتہ نسب اس کے لیے کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا وطن بھی اسلام اور اس کا نسب بھی اسلام۔ عشق محمدؐ اس تمام ملت کا شیرازہ بند ہے جو اطراف و اکناف عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں عقائد اور فقہ میں بہت سے اختلاف پائے جاتے ہیں اور ہر

فرقہ وجہ اختلاف کو اس قدر اساس تصور کر لیتا ہے کہ اس کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیتا ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے متعلق بھی تصورات میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی شخص اسلام دُنیا میں ایسا مل سکے جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا ہو اور محبت رسولؐ سے اس کا دل بالکل خالی ہو۔ راقم الحروف کو ایسے مسلمانوں سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا ہے جو جدید الحادی تعلیم کی بدولت دین کے بنیادی عقائد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے لیکن ناموس رسولؐ پر جان قربان کرنے کو تیار تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نفسیات اس بارے میں کیا کہتی ہے کہ بے دین ہونے کے باوجود ذکر رسولؐ پر میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ عقائد سے معرا ہونے کے باوجود یہ شخص ملت اسلامیہ کے مفاد کے لیے سراپا ایثار تھا۔ مسلمان کی اسی نفسیات کو، جسے الحاد بھی بدل نہ سکا، اقبال نے ان اشعار میں پیش کیا ہے:

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم — زین جہت با یک دگر پیوستہ ایم
عشق او سرمایۂ جمعیت است — ہمچو خون اندر عروق ملت است

ترک فرنگ آلودہ ہو جائے یا چینی اشتراکیت کی لپیٹ میں آ جائے لیکن جب کبھی نسل و نسب میں مختلف کسی مسلمان سے ملتا ہے تو اس کے سینے میں اخوت کے جذبے کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب اس رشتے کی بدولت ہے جو عشق محمدیؐ نے پیدا کیا:

با شیر اندرون شد و با جاں بدر شود

(حافظ)

عشق در جان و نسب در پیکر است — رشتہ عشق از نسبت محکم تر است
عشق درزی از نسب باید گذشت — ہم ز ایران و عرب باید گزشت
ہر کہ پا در بند اقلیم و جد است — بے خبر از لم یلد و لم یولد است

ولم یکن له کفواً احد

تمام موجودات میں خدا کا کوئی ہمسر نہیں۔ یہ صفت بھی مرد مومن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لا لہ سر کوہسار کی طرح وہ کسی گلچیں کے دامن میں نہیں پڑتا۔ وہ جہاں کے اندر ہے لیکن جہاں سے الگ اور بالاتر ہے۔ مومنوں کی ملت اسی طرح بے ہمتا ہو سکتی ہے کہ اس انداز کی کوئی اور ملت نہ ہو:

رشتہ با 'لم یکن' باید قوی — تا تو در اقوام بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است ولاشریک — بندہ اش ہم در نسازد با شریک

مومنوں کے متعلق جو انتم الاعلون کی بشارت دی گئی ہے، اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ نہ صرف دوسری ملتوں بلکہ فطرت کی تمام قوتوں سے بالاتر ہے۔ جس مومن اور جس ملت کے یہ صفات بیان کیے گئے ہیں وہ

اس وقت تو پردۂ عالم پر کہیں نظر نہیں آ رہی۔ مرد مومن کی پرواز تو ایسی فلک رس ہونی چاہیے کہ اس کا طائر رُوح ستاروں میں دانہ چینی کرے بلکہ اپنی بلند پروازی میں افلاک کو پیچھے چھوڑ جائے۔ لیکن اس وقت مسلمان کا یہ حال ہے جیسے مٹی کے اندر بسنے والا کیڑا ہو جو فضائے ارضی سے بھی نا آشنا ہے۔ اپنے آپ کو پسماندہ اور ذلیل پا کر گردش ایام کا شکوہ کرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ قرآن کو ترک کرنے کی وجہ سے اس کی یہ گت بنی ہے۔ مرد مومن کی پرواز کا تو یہ حال ہے کہ:

طائرش منقار بر اختر زند   آنسوئے ایں کہنہ چیز پر زند
تو بہ پروازے پرے نکشودۂ   کرمک استی زیر خاک آسودہ
خوار از مہجوری قرآں شدی   شکوہ سنج گردش دوراں شدی

مثنوی کے اختتام میں بحضور سرورِ کائناتؐ مصنف کی عرض حال ہے۔

ویسے تو اقبال کا تمام کلام خلوص سے لبریز ہے اور اس کی دلدوز تاثیر اسی خلوص کی بدولت ہے۔ محض فن اور صناعی سے یہ دل رسی پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اس عرض حال میں خلوص اور عشق رسولؐ کا ایک ایسا ولولہ ہے کہ پڑھنے والے حساس انسان کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہے۔ اقبال کی صحبت سے فیض یاب احباب سب نے یہ دیکھا کہ شباب غفلت انگیز کے دور سے لے کر شیب عرفان اندوز تک اس عاشق رسولؐ کی یہی کیفیت رہی کہ رسولؐ کا نام سنتے ہی طبیعت پر رقت طاری ہو گئی، خواہ اقبال اس وقت رندوں کی محفل ہی میں ان کا ہم مشرب بن کر بیٹھا ہو۔ اس عرض نیاز میں پہلے عشق سے لبریز کچھ اشعار کہے ہیں، اس کے بعد اپنی داستان درد بیان کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اقبال کے معتقدین اس کو عارف باللہ اور مجدد عصر سمجھنے لگے تھے اور اس کی خامیوں کا ذکر اس کی توہین شمار ہوتا تھا لیکن لوگوں کی عقیدت سے ناجائز فائدہ اُٹھانا کبھی اقبال کا شیوہ نہ تھا، دم واپسیں میں وہ اپنی تمام حالت کو طشت از بام کرتا ہے اور اپنی تمام عمر پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ اپنا نامہ اعمال اس ہستی کے سامنے رکھتا ہے جو ناگفتہ بھی اس کے حال سے آشنا ہے۔ اپنی حالت کے ساتھ ساتھ ملت کی خدستہ حالی کو بھی پیش کرتا ہے۔ نہ اپنے متعلق کسی غلط تفاخر سے کام لیتا ہے اور نہ ملت اسلامیہ کو اس کی موجودہ حالت میں وہ اسلام پر عمل پیرا سمجھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ملت کا حال اس زمانے میں ایک جسد بے رُوح کی طرح ہے۔

شروع یہاں سے کرتا ہے کہ جب سے میری نظر کے سامنے رسول اللہؐ کی ہستی آئی تب سے میری یہی کیفیت ہے کہ رسولؐ مجھے ماں باپ سے زیادہ محبوب ہو گئے:

عشق در من آتشے افروخت است   فرصتش بادا کہ جانم سوخت است

میری یہ کیفیت اس زمانے میں بھی تھی جب میں حسینوں سے عشق بازی کرتا تھا، ان کی صحبت میں

شراب پیتا تھا:

مدتے با لالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم بر چراغ عافیت داماں زدم

شباب کی ان ہوس رانیوں کے ساتھ ساتھ میرے تفکر اور عقائد کی یہ حالت تھی کہ عقل صنم تراش نے مجھے پجاری بنا لیا تھا۔ مگر خالی عقل وظن انسان کو کسی یقین تک تو نہیں پہنچاتے، چنانچہ میں بھی یقین و ایمان سے خالی حقائق حیات کے بارے میں شک میں گرفتار تھا اور یہ تشکیک میرے تفکر کا جزو لاینفک بن گئی تھی۔ ظن وگمان کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک طرف حسینوں کا عشق ہوس پرور اور دوسری طرف عقل آزر پیشہ، ان دو بجلیوں نے میرا حاصل سوخت کر دیا تھا، میرا متاع خیال و دماغ ان دو ڈاکوؤں کی دست برد سے نہ بچا:

برقہا رقصید گردِ حاصلم رہزناں بردند کالائے دلم
عقل آزر پیشہ ام زنار بست نقش او در کشورِ جانم نشست
سالہا بودم گرفتارِ شکے از دماغِ خشک من لاینفکے
حرفے از علم الیقین ناخواندۂ در گماں آباد حکمت ماندۂ

ایک عرصے تک اس ظلمت عقل و ہوس میں گمراہ رہنے کے بعد مجھے توفیق الٰہی سے ایمان و یقین حاصل ہوا اور اسرار قرآن مجھ پر منکشف ہونے لگے۔ مجھے جو بصیرت حاصل ہوئی میں نے اسے آب حیات سمجھ کر اس مردہ قوم کے حق میں ٹپکایا، مبدء فیاض نے نوا گری عطا کی تھی، میں نے شمع نوا سے محفل میں روشنی پیدا کی:

مردہ بود، از آب حیواں گفتمش سرے از اسرار قراں گفتمش
محفل از شمع نوا افروختم قوم را رمز حیات آموختم

لیکن افسوس کہ اس مردہ قوم کو زندہ نہ کر سکا، اب اس کی نعش کو میں حضورؐ کے سامنے لایا ہوں کہ آپؐ ہی اس کے احیا کا کوئی سامان پیدا کریں۔ مجھے اسرار قرآنی پیش کرنے کا اس مردہ قوم سے یہ صلہ ملا کہ لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص فرنگستان سے کچھ باتیں سیکھ آیا ہے، اپنی شاعری سے وہی جادو ہم پر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساز میں سے جو آواز نکلتی ہے وہ حکمت قرآنی نہیں بلکہ ساز فرنگ کی غوغا آرائی ہے:

گفت برما بندد افسون فرنگ ہست غوغایش بہ قانون فرنگ

جس قوم کا یہ حال ہو اس کو میرے جیسا نوا گر بے عمل کیا زندگی بخشے گا۔ مسلمان توحید و نبوت کے اسرار سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ اس نے بیت الحرام کو بت خانہ بنا دیا ہے۔ اپنے آپ کو موحد اور برہمن کو مشرک

اور بت پرست کہتا ہے لیکن ہمارا شیخ، برہمن سے زیادہ کافر ہے۔ ایک پورا سومنات اس کے مغز کے اندر موجود ہے۔ کچھ عجمی تصورات کو اسلام سمجھ کر اپنے فکر وعمل انھیں کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس کے اندر قلب زندہ نہیں رہا، وہ کافر کی طرح موت سے ترساں ولرزاں ہے۔ یہ کافر مسلم نما مجھ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قرآن کی تعلیم کا ثمرہ نہیں ہے۔ اگر اس بارے میں میں نے اپنے آپ کو اور قوم کو دھوکا دیا ہے تو اے محبوب خداؐ اس کی سزا یہ ہے کہ دُنیا اور آخرت میں سب کے سامنے رسوا کیا جاؤں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است — در بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردہ ناموس فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوا و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

ملت کی اس خستہ حالت کو بیان کرنے کے ساتھ ہی اپنی اس کوتاہی کو بھی حضور سرور کائنات میں پیش کیا ہے کہ میری زندگی میں میرا عمل اس عشق وعرفان کا مظہر نہیں جو مجھے عطا ہوا اور جس سے میں نے دوسروں کو بھی زندہ کرنے کی کوشش کی۔ میری یہ عرض خدائے عزجل کے سامنے پیش کر دیجیے کہ عشق اور علم کی دولت دی ہے تو عمل کی توفیق بھی عطا ہو:

عرض کن پیش خدائے عزوجل — عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولت جان حزیں بخشندہ ای — بہرہ از علم دیں بخشندہ ای
در عمل پایندہ تر گرداں مرا — آب نیسانم گہر گرداں مرا

ایک آرزو میرے دل میں ہمیشہ چٹکی لیتی رہی، لیکن میں شرم کے مارے اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے اعمال میرے علم وعشق کے مقابلے میں نہایت پست تھے:

زندگی را از عمل ساماں نبود — پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہار او آید مرا — شفقت تو جرأت افزاید مرا

آرزو یہ تھی اور ہے کہ میری موت حجاز میں واقع ہو۔ تیرے دیار کے باہر تو مجھے دیر ہی نظر آتا ہے۔ بہت افسوس ہوگا کہ اگر میرے جسم کو بت خانے میں گاڑا جائے۔ اگر میں جو روضہ رسولؐ میں مدفون ہوں اور قیامت کے روز میرا حشر وہیں سے ہو تو میں اسے کمال سعادت سمجھوں گا:

حیف چوں او را سرآید روزگار — پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من — وائے امروزم خوشا فرداے من
کو کہم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایہ دیوار بخش

افسوس ہے کہ اقبال کی اس آرزو کا اس انداز میں پورا ہونا تقدیر الٰہی میں نہ تھا، لیکن اس ہیچمدان کے

نزدیک اس کی آرزو پوری ہوئی۔ اقبال کی تعلیم یہ تھی کہ مومن کا پیوند کسی خاک سے نہیں ہوتا۔ مومن کے تمام روابط رُوحانی ہوتے ہیں۔ اقبال کو عالم گیر کی عظیم الشان شاہی مسجد کے سایہ دیوار میں مرقد نصیب ہوا۔ ہر مسجد خدا اور رسولؐ کا گھر ہے۔ یہ مسجد لاتعداد مسلمانوں کے درود وسجود کا محل ہے۔ رُوحانی لحاظ سے یہ بھی روضہ رسولؐ کا قرب ہے۔

اقبال جو اپنی بے عملی کا مسلسل اعلان کرتے رہے راقم الحروف اس سے متفق نہیں۔ کیا انسانوں کی بصیرت افروزی، ملت کی ہمت افزائی، عشق کی فراوانی اور ارزانی، تفکر کی وسعت اور ثروت، اعمال صالحہ میں داخل نہیں؟ میرے نزدیک یہ عمل ہزار عالموں، عابدوں، زاہدوں اور صوفیہ کی ریاضتوں سے زیادہ باقیمت ہے۔ معلوم نہیں کہ علامہ اقبال اس کو کیوں عمل شمار نہ کرتے تھے۔ میرے نزدیک اقبال کے عارفانہ اور عاشقانہ کلام کا ہر شعر عبادت میں داخل ہے۔ اس سے زیادہ خدمت خلق اور کیا ہوسکتی ہے کہ رہتی دُنیا تک لوگ اس کے کلام سے بلند ترین افکار اور تاثرات حاصل کرتے رہیں گے۔ یہ صدقۂ جاریہ ہے مومن کی زندگی کا نصب العین علامہ اقبال کے نزدیک اتنا بلند تھا کہ وہ اس عرش بوس بلندی کے مقابلے میں اپنے تئیں پستی میں محسوس کرتے تھے۔ مقصود کی بلندی کسی اعلیٰ درجے کے محسن انسان کو بھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں رہنے دیتی۔ خوب تر کے مقابلے میں خوب بھی ناخوب دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کے کلام سے بعض افراد کی زندگی میں ایک انقلاب آفریں ہیجان پیدا ہوا۔ آئندہ بھی ملت اسلامیہ کے ہر انقلاب میں اقبال موجود ہو گا۔ جس شخص کا پیغام سراپا پیغام عمل ہو، کیا وہ سرچشمہ عمل خود عمل سے محروم ہے؟ لوگوں نے جس چیز کو عمل سمجھ رکھا ہے وہ اس حیات افزا پیغام وتلقین کے مقابلے میں اکثر پست ہی ہوتا ہے۔ اقبال کو اپنی بے عملی پر جو افسوس ہے وہ اس کی علو ہمت اور رفعت مقاصد کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں کے مقاصد پست ہوتے ہیں وہ ان مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور جو کچھ حاصل ہو جائے اس سے مطمئن بھی ہو جاتے ہیں لیکن گناہوں سے پاک اور اگلی پچھلی خطائیں بخشا ہوا نبی اپنی رُوحانی ترقی میں کسی موجودہ حالت پر قانع نہیں ہوتا اور گنہگاروں سے زیادہ استغفار اس کا صبح وشام کا وظیفہ ہوتا ہے۔ عمل میں کوتاہی کا احساس ایمان کی قوت اور مقصد کی بلندی کا شاہد ہے، ادنیٰ درجے کے لوگ جن اعمال کو حسنات شمار کرتے ہیں، بلند مقصد اور بلند حوصلہ انسانوں کو ان میں سیئات کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

استحکام خودی اور اس کا ہشت گانہ دستور العمل☆

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اقبال نے اپنا پیغام، جو استحکام خودی سے عبارت ہے، اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی میں مجملاً پیش کر دیا ہے۔ یہ کتابیں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد وہ تا دم وفات، اسی پیغام استحکام خودی کی توضیح وتشریح کرتے رہے جو اُنھوں نے ان دو بنیادی کتابوں میں پیش کیا تھا۔

اسرارِ خودی میں انفرادی خودی اور رموزِ بیخودی میں اجتماعی خودی کی تربیت کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔

رموزِ بیخودی کے خاتمے پر اُنھوں نے ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' کے ذیل میں آنحضرت ﷺ کو یوں مخاطب کیا ہے:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن ایں خیاباں راز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

نیز زبورِ عجم میں اپنے پیغام کی بنیاد کی وضاحت بایں الفاظ کی ہے:

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام تا درخشی مثل تیغ بے نیام

اقبال نے اپنی ہر کتاب میں اس قسم کے اشعار لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام اور پیغام دونوں کا ماخذ اور منبع قرآن ہے جس کے بارے میں اُنھوں نے بڑے تحکمانہ انداز میں یہ کہا ہے کہ:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

☆ جناب یوسف سلیم چشتی نے اقبال اکادمی کے زیر اہتمام ۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء کو ایک خصوصی لیکچر دیا تھا۔ یہ مضمون اس لیکچر کے اہم اقتباسات پر مشتمل ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

نوع انسان را پیام آخریں
حامل او، رحمۃ للعالمین

اس حقیقت کو، کہ اُن کے پیغام کا ماخذ، قرآن ہے، ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ جو شخص بھی اقبال کو قرآنی عینک کے بغیر پڑھے گا وہ حقیقی اقبال سے کبھی آشنا نہ ہو سکے گا۔ چونکہ مسلمانوں نے اقبال کو ترجمان القرآن کے بجائے محض ایک شاعر یا قومی شاعر یا فلسفی شاعر سمجھا اس لیے اُنھوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے بارگاہ رسالت میں یوں عرض کیا تھا:

ازاں رمزے کہ گفتم پے نہ بردند   ز شاخ نخل خرما بر نخوردند
من اے میر اممؐ داد از تو خواہم   مرا یاراں غزلخوانے شمردند

کتنی عجیب بات ہے کہ ۱۹۱۳ء میں بھی انھیں اپنی قوم سے یہی شکایت تھی۔ چنانچہ اسرار کے دیباچے میں کہتے ہیں:

آشنائے من ز من بیگانہ رفت   از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی او را دہم   تخت کسریٰ زیر پائے اور نہم
او حدیث دلبری خواہد زمن   آب و رنگ شاعری خواہد زمن

۱۹۲۲ء میں اُنھوں نے پیامِ مشرق کے دیباچے میں اپنا موازنہ گوئٹے سے کیا ہے:

او چمن زادے چمن پروردۂ   من دمیدم از زمین مردۂ

اس ایک مصرع میں اُنھوں نے اپنے کرب باطنی اور احساس ناکامی کی مکمل داستان قلمبند کر دی ہے۔

بہر حال میرا مقصد اس تلخ حقیقت کے اظہار سے صرف یہ ہے کہ اقبال نے قوم کے سامنے استحکام خودی کا ایک دستور العمل پیش کیا تھا جسے قوم نے نہ اُن کی زندگی میں درخور اعتنا سمجھا اور نہ وفات کے بعد اس کی طرف توجہ کی۔ اسی لیے اُنھوں نے وفات سے ایک ماہ پہلے اپنے جذبات کا اظہار بایں الفاظ کیا:

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک   ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کسی ندانست ایں مسافر   چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

یعنی کسی نے نہ جانا کہ:

۱- میں نے کیا پیغام دیا ۲- کس کو پیغام دیا ۳- میرے پیغام کا ماخذ کیا تھا۔

اقبال یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی خودی کو مستحکم کر کے محض حکمرانی اور جہاں بانی پر اکتفا نہ کریں بلکہ نیابت وخلافت الٰہیہ کے مقام پر بھی فائز ہو جائیں جس کا وعدہ اللہ نے اُن سے بایں الفاظ کیا ہے:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ۔ (۲۴:۵۵)

میں نے ایک مرتبہ اقبال سے پوچھا کہ آپ کے اس بنیادی پیغام (استحکام خودی) کی قرآنی بنیاد کیا ہے؟ تو اُنھوں نے فوراً جواب دیا ''کیا تم نے سورۂ مائدہ میں یہ آیت نہیں پڑھی؟ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَیۡکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ لَا یَضُرُّکُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اہۡتَدَیۡتُمۡ (۵:۱۰۵)

دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے مومن کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ محبت میں اشد ہوتا ہے۔

والذین آمنوا اشد حباً للّٰہ۔

تیسری بات: قرآن کی رُو سے اللہ سے محبت کا طریقہ اتباع رسول ہے۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ۔

چوتھی بات: قرآن کی رُو سے اتباع رسول کا ثمرہ یہ ہے کہ اللہ (اُس) متبع رسول سے محبت کرنے لگتا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ دراصل مومن وہ ہے جو اللہ کو اپنا محبوب بناتا ہے۔ مومنانہ زندگی کی روح محبت الٰہی ہے۔ اسی لیے اقبال نے یہ چونکا دینے والی بات کہی:

طبع مسلم از محبت قاهر است　　مسلم ار عاشق نباشد، کافر است

میری رائے میں، موجودہ زمانے میں مذکورہ بالا حقیقت کو واضح کرنا، سب سے بڑی دینی اور قومی خدمت ہے۔

اقبال کے پیغام کی قرآنی بنیادوں کو واضح کر دینے کے بعد، اب میں انھی کے الفاظ میں استحکام خودی کا دستور العمل پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار　　تا کمند تو کند یزداں شکار
اندکے اندر حرائے دل نشیں　　ترک خود کن، سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو، سوئے خود گام زن　　لات و عزائے ہوس را سر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق　　جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا

ثمرہ:

شرح انی جاعلٌ سازد ترا

اس پروگرام کا پہلا شعر بطور تمہید ہے اور قرآن کی مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ ہے۔ ان کنتم تحبون الله، فاتبعونی یحببکم الله۔ اس آیت میں تین واضح جملے ہیں: آنحضرتﷺ فرماتے ہیں کہ:

۱- اگر تم اللہ سے محبت کی آرزومند ہو

۲- تو میری (ذات رسالت) اتباع یعنی تقلید کرو

۳- ثمرہ اس تقلید کا یہ ہوگا کہ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا

اب اس شعر کو ملاحظہ کیجیے۔ اس میں بھی تین باتیں یا تین جملے ہیں:

۱- کیا تو عاشق ہے؟ اگر ہے

۲- تو اپنی خود کو اتباع رسول یا تقلید یار کی بدولت مستحکم یا محکم کر لے

۳- ثمرہ اس استحکام خودی کا یہ ہوگا کہ تو خود یزداں کو اپنی کمند محبت میں گرفتار کر لے گا یعنی یزداں تجھ سے محبت کرنے لگے گا۔

آئندہ تین شعروں میں ''تقلید یار'' کو بالتفصیل بیان کیا ہے اور اس تفصیل ہی میں استحکام خودی کا طریق ہشت گانہ (The eightfold Programme of Self-fortification) مندرج ہے۔

آخری شعر میں استحکام خودی کے اقتضا پر عمل کا منطقی نتیجہ واضح کر دیا ہے یعنی یہ کہ مقلد رسول خلافت الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو جائے گا۔

اب میں ان تین اشعار کی شرح کیے دیتا ہوں جن میں استحکام خودی کا طریق ہشت گانہ بیان کیا گیا ہے۔ استحکام خودی کی

پہلی منزل: اندر کے اندر حرائے دل نشیں

جس طرح آنحضرتﷺ نے کچھ عرصہ غار حرا میں خلوت اختیار کی تھی تو بھی اسی طرح خلوت اختیار کر اور اس کے لیے تو اپنے ''دل'' کو غار حرا بنا لے تاکہ تجھے اس طویل سفر کی زحمت لاحق نہ ہو اور اس خلوت میں وہی کام کر جو آنحضرتﷺ نے کیا تھا۔ اگر تجھے یہ بات معلوم نہ ہو تو کسی واقف کار یار درویش بے گلیم سے پوچھ لے۔

حدیث دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

دوسری منزل: ''ترک خود کن'' اپنی خودی کو ترک کر دے۔

یہاں اقبال وہی تعلیم دے رہے ہیں جو ''پاکان امت'' ابتدا سے دیتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ خود اپنی آخری تصنیف ارمغان حجاز میں آخری بات یہی کہتے ہیں: غور سے سنیے

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم حدیث عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکان امت ترا باشوخیِ رندانہ گفتم

پاکان امت نے ترک خودی سے ترک خواہشات نفس مراد لی ہے نہ کہ نفیِ خود یا نفیِ ذات جیسا کہ بعض لوگ اپنی نادانی کی بنا پر سمجھتے ہیں اور ان کے بارے میں سوءِ ظن سے کام لیتے ہیں۔

قصہ کوتاہ اقبال بھی ترک خودی سے ترک خواہشات نفس مراد لیتے ہیں۔

تیسری منزل: سوئے حق ہجرت گزیں یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی کے بجائے حق کے احکام کی پیروی کرو۔ جب تک ترک خودی کی منزل طے نہیں ہوگی، ہجرت الی الحق محال ہے۔

چوتھی منزل: محکم از حق شو یعنی اطاعت احکام ایزدی سے اپنی خودی کو مستحکم کر لو۔

پانچویں منزل: ''سوئے خود گام زن'' اب اپنی خودی کی طرف واپس آ جاؤ یعنی اب تمھاری خودی وہ شیطانی خودی نہیں ہے جو تمھیں برائی کی طرف آمادہ کیا کرتی تھی جس پر اِن النفس لا مارة بالسوء شاہد ہے۔ بلکہ اب تمھاری خودی اطاعت احکام الٰہی سے مسلمان ہو چکی ہے۔ اس لیے اب اس کے احکام پر عمل کر سکتے ہو۔

چھٹی منزل: لات و عزائے ہوس را سر شکن

چنانچہ اب تمھاری خودی جو محکم از حق ہونے سے پہلے تمھیں لات و عزائے ہوس کی عبادت کی تعلیم دیا کرتی تھی، اپنی قلب ماہیت کی وجہ سے اس قدر مستحکم ہو چکی ہے کہ اب وہی خودی ان بتوں کو پاش پاش کر سکتی ہے لہٰذا اب تم اللہ کا نام لے کر کعبۂ دل کو اسی طرح بتوں سے پاک کر دو جس طرح آنحضرتؐ نے کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک کیا تھا۔ اگر صحابہ کرامؓ اتباعِ رسول کی بدولت، اپنی اجتماعی خودی کو مستحکم نہ کر لیتے تو وہ لاکھ آرزوؤں کے باوجود خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک نہیں کر سکتے تھے۔

اگر پاکستان کے مسلمان اس سرزمین کو پاک کرنا چاہتے ہیں تو انھیں بھی صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی اجتماعی خودی کو اتباع رسول کی بدولت مستحکم کرنا لازمی ہے۔

ساتویں منزل: لشکرے پیدا کن از سلطان عشق

اب تم اس قابل ہو کہ عشق کی برہان کی مدد سے ایک لشکر مجاہدین تیار کرو جس کے ہر مجاہد نے اتباعِ رسول سے اپنی انفرادی خودی کو مستحکم کر لیا ہو۔

آٹھویں منزل: جلوہ گر شو بر سر فاران عشق

اب فارانِ عشق یعنی مقامِ عشق الٰہی پر فائز ہونے کے بعد، باطل کو چیلنج دو اور اللہ کا نام لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑو۔ جس طرح صحابہ کرام اللہ کا نام لے کر بدر کے میدان میں کود پڑے تھے۔

اسی دستور العمل ہشت گانہ کا خلاصہ اقبال نے دو مرحلوں میں بیان کر دیا ہے۔ مرحلہ اوّل: اطاعت الٰہی۔ مرحلہ دوم: ضبطِ نفش اور اس کا ثمرہ نیابت الٰہی ہے۔ دراصل یہ استحکام خودی یا ضبطِ نفس (Self Control) کا پروگرام قرآن سے ماخوذ ہے مگر مسلمانوں نے چونکہ ایک عرصہ دراز سے قرآن کو ضابطہِ حیات کے بجائے ''تبرک'' سمجھ رکھا ہے جیسا کہ اقبال کے اس شعر سے واضح ہے:

با یاتش ترا کارے جز ایں نیست　　کہ از یٰسین او آساں بمیری

اس لیے انھیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ پہلی وحی جس میں احکام نازل ہوئے سورۂ مزمل کی ابتدائی گیارہ آیات پر مشتمل ہے جن میں ضبطِ نفس، تزکیۂ نفس یا تربیت خودی (استحکام خودی) کا ہشت گانہ پروگرام مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

غور کیجیے:

۱۔	قم اللیل الا قلیلا	۵۔	فاتخذہ وکیلا
۲۔	رتل القرآن ترتیلا	۶۔	وصبر علی ما یقولون
۳۔	واذکر اسم ربك	۷۔	واھجرھم ھجراً جمیلا
۴۔	وتبتل الیه تبتیلا	۸۔	وذرنی المکذبین ومھلھم قلیلاً

افسوس کہ ان آیات کی تشریح میرے موضوع سے خارج ہے۔ یہ آیات میں نے محض اس لیے لکھ دی ہیں کہ میرا دعویٰ ثابت ہو سکے۔ اقبال کی ساری تعلیمات قرآن و حدیث یا ارشادات پاکان امت پر مبنی اور انھی سے ماخوذ ہیں۔

اب رہا تزکیۂ نفس یا ضبطِ نفس کا پروگرام تو یہ اقبال یا اسلام سے مختص نہیں ہے۔ تمام بڑے مذاہب نے ضبطِ نفس یا استحکام خودی کا ضابطہ انسانوں کو دیا ہے مثلاً بودھ دھرم میں تزکیۂ نفس کے لیے اشٹنگ مارگ یا طریق ہشت گانہ متعین کیا گیا ہے۔

جین دھرم میں اسی مقصد کے لیے طریق دہ گانہ اور ہندو دھرم میں طریق ہشت گانہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ چونکہ ان مذاہب کے دساتیر العمل کی تفصیل میرے موضوع سے خارج ہے اس لیے اس سے قطع نظر کرتا ہوں۔ بس اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ استحکام خودی کی تعلیم دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہے کیونکہ ضبطِ نفس کے بغیر کوئی شخص نہ روحانی ترقی کر سکتا ہے نہ اخلاقی۔ یعنی شخصیت کی تشکیل اسی تزکیۂ نفس پر موقوف ہے۔

اسی لیے سرکارِ دو عالم ﷺ نے مکہ میں پورے بارہ سال تک صحابہ کے نفوس کا تزکیہ فرمایا تھا۔ جسے اقبال نے استحکام خودی سے تعبیر کیا ہے۔ یوں سمجھو جسے قرآن تزکیۂ نفس کہتا ہے اقبال اسی چیز کو استحکام خودی یا تربیت خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہر حال استحکام خودی کا نتیجہ ۲ھ میں جنگِ بدر میں کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حضرت اکبرالہ آبادی نے اس حقیقت عظمیٰ کو یوں بیان کیا:

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھکو بدر سے غار حرا پہلے

یعنی اگر آنحضرتؐ سب سے پہلے صحابہ کی خودی کو مستحکم نہ کرتے تو جنگِ بدر میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔

ٹھیک اسی طرح اقبال یہ چاہتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنی خودی کو مستحکم کرلیں تاکہ باطل سے پنجہ آزما ہو سکیں اور کامیابی کے بعد جب اللہ انھیں حکومت عطا فرمائے تو وہ صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کے نقوش قدم پر چل سکیں۔ اور اس حقیقت کے واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ جو قوم اپنی خودی کو مستحکم نہیں کرتی وہ اگر برسرِ حکومت آجاتی ہے تو ہر قدم پر غلطیاں کرتی ہے اور اس طرح ضلوا واضلوا کا مصداق بن جاتی ہے۔

(شرح رموزِ بیخودی از یوسف سلیم چشتی)

رموزِ بیخودی — تبصرہ

پروفیسر اے۔ جے۔ آربری
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

مستقبل کا مؤرخ جب ہمارے دور کے اہم واقعات کا جائزہ لے گا تو بلاشبہ ان میں دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد تقریباً دس کروڑ افراد کی ایک ایسی قوم کے اچانک اور حیران کن ظہور کو انتہائی اہم واقعہ قرار دے گا جس کی قومیت کا دعویٰ مذہب کی بنیاد پر تھا اور افراد کی بہت بری اکثریت اسی مذہب سے وابستہ تھی۔ ہم ابھی ظہورِ پاکستان کے اتنے قریب ہیں کہ پوری طرح ہندوستان کے مسئلے کے اس ڈرامائی حل کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں، جس نے ہمارے آباء واجداد کے ذہنوں کو پریشان کیے رکھا تھا۔ تاہم اخباروں کا سرسری مطالعہ کرنے والا قاری بھی اب قیامِ پاکستان اور دنیا کی سیاست کے اہم رجحانات پر اس کے اثرات کو کسی قدر سمجھنے لگا ہوگا۔ اقوامِ متحدہ کے مباحثوں میں پاکستانی مندوب نے اس قدر توجہ اور عزت حاصل کی ہے کہ خواہ وہ مسئلہ کشمیر کی بات ہو یا مراکش اور تیونس کے احساسات کی ترجمانی، بین الاقوامی سیاسی منظر کا کوئی انتہائی کند ذہن مبصر ہی ہوگا جواب بھی محسوس نہ کرتا ہو کہ یہ نیا ملک دنیا کی تاریخ کے آئندہ ڈرامے میں ایک نہایت اہم کردار ادا کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔

جب مستقبل کا مؤرخ ان اسباب کا تجزیہ کرے گا جو ظہورِ پاکستان کا سبب بنے تو وہ لازماً ایک ایسی شخصیت کی تحریروں کو بھی مدِنظر رکھے گا جو بعض لوگوں کے بقول اس عظیم مملکت کی خالق اور بعض لوگوں کے بقول خالقوں میں سے ایک تھی —— سر محمد اقبال (۱۹۳۸ء تا ۱۸۷۷ء) جسے ولفرڈ اینٹول سمتھ نے اپنی اہم کتاب ہندوستان میں جدید اسلام میں اس صدی کا ممتاز مسلمان شاعر اور مفکر قرار دیا ہے اور جس کی عظمت کا پیمانہ اسے حاصل ہونے والی بین الاقوامی توجہ اور عزت قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستانی صوبوں کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے اُنھوں نے ایک خواب دیکھا تھا مگر اس کی خلاف توقع فوری تعبیر سے پہلے ہی وہ وفات پا گئے۔ ان کی زندگی کے آخری چند سال ذہنی اور جسمانی کرب میں بسر ہوئے مگر انھیں یہ سکونِ

قلب نصیب نہ ہو سکا کہ جس مقصد کے لیے میں نے اس قدر جدوجہد کی ہے، وہ حاصل ہونے ہی والا ہے۔لیکن آزادیِ پاکستان کے ساتھ ہی مطبوعات کی ایک لہر آئی جس میں انھیں دنیا کی اس متمول ترین اور سب سے زیادہ آباد مسلم مملکت کے روحانی بانی کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔اس سند کو آج بھی اسی قدر اہمیت دی جاتی ہے۔

اقبال شاعر ہونے کے علاوہ ایک فلسفی بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنا فلسفہ نثر کی بجائے شاعری میں پیش کرنے کو ترجیح دی ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ وہ مغرب میں مقابلتاً کم مشہور ہیں اور ان کے بارے میں غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔نثری تحریریں زیادہ تر انگریزی میں ہیں جب کہ شاعری اُردو اور فارسی میں ہے جو اُن زبانوں کے ادبیات کی روایتی تصویروں سے بھری پڑی ہے۔ جب اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو لامحالہ یہ کس قدر دوراز کار اور اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے۔علاوہ ازیں اقبال کا اسلوب با محاورہ ہے اور کم ہی اتفاق ہوتا ہے کہ ان کی فکر پیچیدہ نہ ہو۔ان کا اظہار اپنی زبان کی نوعیت کے اعتبار سے بے حد نازک ہوتا ہے۔ جب کہ ان کے ہاں شعری متصورہ کی بہتات اُس قاری کو بوکھلا دیتی ہے جو اس کی فوری تبدیلیوں اور خطابیہ تنوع کی سطح کے نیچے پائی جانے والی فکری ہم آہنگی سے آگاہ نہیں ہوتا۔ میرے علم میں ایسا کوئی اور مشرقی شاعر نہیں ہے جو مترجم کے لیے ایسی مختلف النوع اور کڑی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔

اقبال کی عظمت پہلی مرتبہ اسرار خودی کی اشاعت سے آشکار ہوئی۔ یہ فارسی میں فلسفیانہ حماسہ ہے جس کا ترجمہ آنجہانی آر۔ اے۔ نکلسن نے سیکرٹس آف دی سیلف کے عنوان سے کیا ہے (میکملن: ۱۹۲۰ء)۔اس نظم میں اُنھوں نے معاشرے میں فرد کی حیثیت کے بارے میں اپنے نظریات کا پہلا حصہ بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے نکلسن کو لکھا تھا: ''زمین پر خدا کی حکمرانی کا مطلب ہے کم و بیش منفرد اشخاص کی جمہوریت جس کی امارت دنیا کے ممکنہ حد تک سب سے زیادہ منفرد شخص کے پاس ہو۔ خودی یا انفرادیت اسرارِ خودی کا بنیادی نظریہ ہے۔ انسان کا اخلاقی اور مذہبی نظریہ نفیِ خودی نہیں، اثباتِ خودی ہے۔ اور یہ نظریہ زیادہ سے زیادہ منفرد اور زیادہ سے زیادہ یکتا ہو کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔'' اقبال کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ کسی حقیقی اسلامی معاشرے ہی میں ممکن ہے کہ فرد مکمل طور پر اثباتِ ذات کے حصول میں کامیاب ہو سکے۔

ان کے نظریے کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی میں بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ میں مسٹریز آف سیلف لیس نس کے عنوان سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کا نظریۂ خودی اگر معاشرے سے الگ تھلگ رہ کر ارتقا پذیر ہو تو وہ غیر معتدل انائیت اور نراجیت پر منتج ہوتا ہے۔ تاہم وہ محض فرد اور اس کے انکشافِ ذات تک اپنی دلچسپیوں کو محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک نظریاتی معاشرے کے قیام کے بھی خواہش

مند ہیں، جسے وہ ملت کے لفظ سے یاد کرنا پسند کرتے ہیں۔فرد ایک معاشرے کے رکن کی حیثیت سے تصادم اور ہم آہنگی کے توام اُصول کے ذریعے اپنے آپ کو بھرپور طریقے سے ظاہر کرسکتا ہے۔ اثباتِ ذات کرنے والے افراد ہی کے ذریعے ملت وجود میں آئی ہے اور تکمیل پاتی ہے۔ اسی طرح اقبال فرد کی آزادیوں پر پابندی لگا کر اسے مادر پدر آزاد آزادی سے بچاتے ہیں اور اسے ایک ہم آہنگ معاشرے کا فرد بناتے ہیں۔اسی طرح معاشرے کے اختیارات کوکم کر کے فرد کی خود شناسی کے راستے میں اسے نا قابلِ تسخیر رکاوٹ کی بجائے چیلنج بنا کر اسے آمریت سے محفوظ رکھتے ہیں۔

ان دونوں نظموں میں مختصراً اور سادہ لفظوں میں یہی بنیادی خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ خیالات تو اتنے نئے نہیں ہیں، نہ ہی یہ دعویٰ نیا ہے کہ اسلام یک آدرشی معاشرہ ہے، تاہم نئی بات یہ ہے کہ اقبال نے فرد اور معاشرے کے اس نظریے کا اطلاق اسلام پر کیا ہے اور اسے اس حیثیت سے دنیا کے تمام مذہبوں اور نظاموں سے برتر قرار دیا ہے۔ اسلامی اتحاد کے لیے موجودہ زمانے میں پروپیگنڈا جمال الدین افغانی (۱۸۳۸-۹۷ء) کے دور سے اب تک مسلسل جاری ہے۔اقبال اسی نقطۂ نظر کا جدید ترین بلکہ قابل ترین اور موثر ترین وکیل تھا۔اس نے ایک ایسی تحریک کے لیے، جو عقلی سے زیادہ جذباتی ہے، ایک عقلی بنیاد مہیا کی۔

رموزِ بیخودی میں اقبال نے بین الاقوامی اسلام کا مقدمہ پیش کیا ہے۔جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی، اقبال ایسی خلافت کے احیا کے بارے میں شدت سے سوچ رہے تھے جو دنیا بھر کے تیس کروڑ مسلمانوں کو ہی مذہبی ریاست کے ماتحت لے آئے۔مگر اسی زمانے میں مملکتِ عثمانیہ کے خاتمے اور خلافت کے مٹنے اور ترکی کے لادین قرار دیے جانے اور متعدد خودمختار یا نیم آزاد عرب ریاستوں کے قیام نے انھیں واقعات میں رجائیت کا رنگ بھرنے سے اجتناب پر آمادہ کیا۔ اُنھوں نے تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (۱۹۳۴ء) میں لکھا ہے:

> ہر مسلمان مملکت کو موجودہ حالات میں اپنی ذات کے باطن میں غوطہ زن ہونا چاہیے۔ عارضی طور پر اپنے نقطۂ نظر کو اپنی ذات پر مرکوز کر لینا چاہیے،حتیٰ کہ یہ مملکتیں اتنی مضبوط ہو جائیں کہ زندہ جمہوریتوں کا ایک کنبہ وجود میں لا سکیں۔قومی مفکرین کے خیال میں ایک سچا اور زندہ اتحاد محض علامتی سربراہ کے ذریعے وجود میں لانا آسان کام نہیں ہے۔اس کا حقیقی وجود آزاد اور خودمختار اکائیوں کو ضرب دینے اور ان کے نسلی امتیازات کو ہم آہنگ کرنے اور انھیں ایک مشترکہ احساساتی پابندی میں مدغم کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا ہمیں رفتہ رفتہ اس صداقت کا احساس دلا رہا ہے کہ اسلام نہ قومیت ہے اور نہ سامراج بلکہ ایک انجمنِ اقوام ہے جو مصنوعی سرحدوں اور نسلی امتیازات کو محض حوالے میں آسانی کے لیے تسلیم کرتی ہے، لیکن

اپنے اراکین کے معاشرتی افق کو محدود نہیں کرتی۔''

اسی ذہنی کیفیت کے ماتحت اقبال نے مسلمانوں کی ہندوستان سے علیحدگی اور پاکستان کے قیام کا پُرزور مطالبہ کیا۔ اگرچہ بہشتِ ارضی کی تاریخ ملتوی کردی گئی لیکن اس عرصے میں اہم کام کرنا ابھی باقی تھا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء کو قاہرہ کے ہفتۂ سیاہ کے واقعات نے بہت سے لوگوں کو، جو ابھی تک اسلام اور مغرب کے تصادم کو غیر اہم سمجھتے تھے، یہ باور کرا دیا ہے کہ ایسی صورتِ حال میں موجود ہے جو انتہائی خطرناک ہے۔ تعجب ہے کہ اس کو اتنی آسانی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ خطرے کی گھنٹیاں بہت دیر سے بج رہی ہیں۔ جب اقبال نے لکھا تھا ''یقین کیجیے یورپ اس وقت انسان کی اخلاقی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے'' تو وہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے تھے جو اُنھوں نے اس سے قبل نہیں کہی تھی۔ اور وہ ایسا محض اکسانے یا صدمہ پہنچانے کے لیے بھی نہیں کہہ رہے تھے، نہ ہی وہ ویرانے میں ابھرنے والی تنہا آواز تھے۔ دنیا کے امن اور تحفظ کے راستے میں موجود خطرات یقیناً اتنے ہی کم نہیں ہیں۔ ان خطرات میں سے کوئی خطرہ صلیبی جنگوں کی فضا کے موجودہ احیا سے بڑھ کر نہیں۔

پیچیدہ مسائل کو انتہائی سادہ بنا کر پیش کرنا شاید بیسویں صدی کا بے حد پریشان کن گناہ ہے۔ وہ دنیا جو تعلیم بالغاں کو مقبولِ عام ذرائعِ ابلاغ کی مدد سے رائج کر رہی ہے اور سنجیدہ ادب سے اجتناب کرتی ہے، اخبارات کی سرخیوں کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ ذہنی طور پر کسی دیانت دارانہ اور بنا بریں حجاب آمیز تجزیے کو قبول نہیں کر سکتی۔ فلسفی ہونے کی وجہ سے اقبال موجودہ دنیا کے رواج کے مطابق بلند آہنگی کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''یورپ کی عینیت پسندی کبھی ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں معکوس انانیت کی شکار اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے والی جمہوریتیں وجود میں آئی ہیں جن کا واحد مقصد دولت مندوں کے مفادات کے لیے غریبوں کا استحصال کرنا ہے۔'' اس قسم کے خیالات واضح کرتے رہے ہیں کہ کمیونسٹوں کو کیوں اس بات میں دقت پیش نہیں آتی کہ وہ اقبال کو اپنا ساتھی قرار دے دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی اور مغربی سیاست دانوں کو اس بات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو دو رنگوں یعنی سیاہ و سفید میں پیش کریں۔ لیکن جب ایک سیاست دان اپنے آپ کو پیغمبر کے طور پر پیش کرے اور پیغمبر مانا جائے تو اس کے لیے موزوں نہیں ہے کہ وہ بچگانہ انداز سے صابن کے بکس کے کھیل میں اُلجھا رہے، جب تک کہ وہ ہٹلر کی طرح تخیلاتی تاخت و تاراج کرنے کا خواہش مند نہ ہو۔

موجودہ زمانے میں یورپ کے متعلق مشرق کی نفرت میرے خیال میں ہمعصر سیاست کا سب سے زیادہ خوفناک اور پریشان کن پہلو ہے اور اسے محض شکست خوردہ سامراجیت کے خلاف فاتحانہ ردِعمل کہہ کر

نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے لیکن اصل اسباب زیادہ گہرے ہیں۔ اس کو محض ان کمتر درجے کے ذہنوں کے صدماتی ردِعمل سے منسوب نہیں کیا جاسکتا جو اس صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں دنیا بھر میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ یورپی تہذیب جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔ اور وہ اس گھونسلے کو تباہ کرنا چاہتے تھے جس سے وہ اپنے خیال میں آگے نکل چکے تھے۔ اگرچہ جو بیج اُنھوں نے بے خیالی میں بوئے تھے وہ زبردست فصل لے آئے ہیں۔ اس کا سبب جنگِ عظیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قتل و غارت بھی نہیں ہے، تاہم ذاتی اصلاح کی ایک کوشش کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ تمام عناصر موجود ہیں اور متحرک ہیں۔ لیکن اس سبب کے نیچے وہ چیلنج پنہاں ہے جو تیرہ صدیاں پہلے صحرائے عرب سے دیا گیا تھا اور جسے بار بار اقبال اس کے پیش رووں اور پیروکاروں نے بیان کیا ہے۔ اسلام خصوصی طور پر خدا کا آخری پیغام ہونے کا دعوے دار ہے اور تمام مذاہب کو ختم کرنے کا مدعی ہے۔

یورپ صدیوں تک اسلام کے ساتھ بایں معنی بے انصافی کرتا رہا ہے کہ اس کے مثبت اضافوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ سبب یہ ہے کہ علمیت مذہبی فرقہ واریت کی لونڈی رہی ہے۔ اس بے انصافی کے خلاف امیر علی اور اس کے دبستان نے بجا طور پر احتجاج کیا تھا۔ اور چونکہ اس قسم کا مجادلہ یورپ کا منتخب ہتھیار رہا ہے اس لیے یورپ کے پاس شکایت کا کوئی جواز نہیں ہے اگر اسلام نے اس ہتھیار کو اُسی فنکاری سے یورپ ہی کے خلاف استعمال کیا ہے۔ گزشتہ صدی کی اعتدال پسند تحریک نے اسلام کی عالمی خدمات کا زیادہ حقیقت پسندانہ طریقے سے اعتراف کیا ہے۔ یورپ کے علما نے، جبکہ امیر علی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، کریمانہ لیکن ضرورت سے زیادہ سادہ انداز اختیار کرتے ہوئے ریاضی، ادویات، سائنس، فنون، ادبیات، قانون، فلسفہ اور سیاسیات میں اسلامی ترقیات کا بہ مسرت اعتراف کرلیا تھا۔ اس انداز کے ورثوں سے خوشہ چینی کا تذکرہ فیشن بن گیا اور دورِ وسطیٰ کے اسلامی ورثے سے یورپ کے استفادے کا بھرپور اعتراف کیا جانے لگا۔ اپنے ماضی کے متعلق زیادہ یقین اور اعتماد سے غیر متعصب عالموں کے ان علمی سندات کو ذوق و شوق سے پیش کرتے ہوئے مسلم معترضین نے یہ الزام لگانا شروع کردیا کہ موجودہ یورپی تہذیب میں جو کچھ اچھا ہے وہ تو اسلام کی وجہ سے ہے اور جو برائیاں ہیں وہ دوسری قوتوں کے سبب سے ہیں۔ ایک ہندوستانی مصنف ایف۔ کے۔ درانی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ''علم، تہذیب اور تمدن میں ساتویں صدی سے موجودہ صدی تک ساری ترقیات براہِ راست یا بالواسطہ بانیِ اسلام کے ذہن سے استفادہ کر کے وجود میں آئی ہیں۔'' اقبال قدرے کم جذباتی کیفیت میں لکھتے ہیں: ''یقین کیجیے انسان کے اخلاقی ارتقا کے راستے میں اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ یورپ ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے قبضے میں وہ امر حقائق ہیں جن کی بنیاد وحی پر ہے۔ یہ حقائق اس کی خارجی ہیئت کو زندگی کی گہرائیوں کے حوالے سے داخلیت میں بدل

دیتے ہیں۔ ہمارے روحانی حقائق جزوِایمان ہیں جن کے لیے ہمارا سب سے کم آ گاہ آدمی بھی جان قربان کر سکتا ہے۔ اسلام کے اس بنیادی عقیدے کے بعد کہ اس کے بعد کوئی شریعت نہیں آ سکتی، ہم روحانی طور پر دنیا کے سب سے زیادہ وسیع المشرب لوگ ہیں۔ آج مسلمانوں کو اپنی اس صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے، اپنی زندگی کو امرِ اُصولوں کے مطابق ڈھالنا چاہیے اور اسلام کے جزوی طور پر حاصل کردہ مقصد کی مدد سے ایسی روحانی جمہوریت وجود میں لانی چاہیے جو اسلام کا آخری مقصد ہے۔'' یقیناً بات اُلٹ گئی ہے۔ عیسائی یورپ کو، جو ایشیا میں اپنی خود ساختہ تہذیب سکھانے کے مقصد کے دعوے دار تھا، اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ خود سے نئے سرے سے مشرقی تہذیب کی مدد سے مہذب بننے کی ضرورت ہے۔

یہ تمام باتیں کتنی پریشان کن ہیں۔ لندن، پیرس یا نیویارک میں کسی آرام کرسی پر بیٹھ کر اس تمام مناقشے کو لفظی جنگ قرار دے دینا آسان ہے لیکن موجودہ اسلامی دنیا سے گزرنے والا کوئی سیاح بھی فوراً اس کی تصدیق کرے گا کہ یہ خطرناک استخراج نتائج ہوگا۔ قاہرہ کے ہفتۂ سیاہ کی آگ اور خون سے قطع نظر، جسے اگر کچھ لوگ چاہیں تو برطانوی سامراجیت کے خلاف ردِعمل قرار دے سکتے ہیں یا کمیونسٹوں کے ہنگامہ کرانے کی کوشش کہہ سکتے ہیں یا مشرقی ہجوم کی روایتی لاقانونیت کا مظاہرہ قرار دے سکتے ہیں، دنیا کے اس وسیع علاقے میں بھی، جو مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے، اگر بیدار مغزی سے دیکھا جائے تو ممکن نہیں کہ اس بات کا غیر اطمینان بخش ادارک نہ ہو کہ اسلام اور یورپ ایک دوسرے کے خلاف تلے کھڑے ہیں اور جنگ یا امن کے درمیان انتخاب زیادہ دور نہیں ہے۔ خواہ ہم اس پسند کریں یا نہ کریں، خواہ ہم ایشیائی ہوں یا یورپی یا افریقی، ہم ایک پُر از خطر دور میں زندگی گزار رہے ہیں اور صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ کی جنگوں کے بعد سے اب تک ایک شدید ترین تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کیا ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حقائق اس سے مختلف ہیں؟ اگر ہم اس خوفناک اور غیر ضروری تصادم سے بچنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے کی از سرِ نو اور ان تھک کوشش کریں اور دیکھیں کہ کیا امکانات ہیں: اوّل کشیدگی کو کم کرنے کے اور اس کے بعد ایک عقلی تعاون کے۔ اور بالآخر ایک مشترکہ مقصد کی طرف ایک ساتھ بڑھنے لگیں۔ رموزِ بیخودی کا ترجمہ کرتے وقت میں نے مسلمانوں کے مقدمے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جسے پُر زور طریقے سے ایک مفکر اور اہم شاعر نے پیش کیا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ایک عیسائی ہوں جسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کوئی مسلمان میرے آبائی مذہب میں شامل ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان موجودہ بدآہنگی اگر بالکل ہم آہنگ نہیں ہو سکتی تب بھی اسے موجودہ جذباتی بحثوں کے منطقے سے نکال کر زیادہ خنک خطے میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ان مباحثوں سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں مذاہب میں اتفاقات کا دائرہ

اختلافات سے وسیع تر ہے اور اس سے یہ توقع پیدا ہو جائے گی کہ اختلاف کسی دن تعاون میں بدل جائے گا۔ اور یہ بات اور بھی جلدی ہو سکتی ہے اگر عیسائی اور مسلمان واضح اور صاف طور پر جان لیں کہ ان کا سامنا ایک مشترکہ دشمن سے ہے جو ان دونوں کو ختم کرنے کے درپے ہے جب تک دونوں مل کر اس کا مقابلہ نہ کریں۔

نکلسن نے اسرارِ خودی کے ترجمے کی بابت لکھا تھا کہ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ہر جگہ اس کے مفہوم کو درست سمجھا ہے یا درست طور پر منتقل کیا ہے۔'' اور میں نے اس کتاب کا ایک ایسا نسخہ بھی دیکھا ہے جس کے حاشیے پر اقبال کی اپنی اصلاحیں ہیں جو اس بات کی نمایاں شہادت فراہم کرتی ہیں کہ نکلسن جیسے عالم کو بھی اقبال کے اسلوب کے ابہامات کو واضح کرنے میں کسی قدر دقتیں پیش آئی ہوں گی۔ میں تو محض نکلسن کی رائے کو اپنی بابت دہرا سکتا ہوں، مگر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ میرا ترجمہ اور زیادہ نا تسلی بخش ہوتا اگر خوش قسمتی سے پاکستان کے مشہور عالموں اور اقبال اکیڈمی کے اراکین نے، جو اقبال کے ذاتی دوست رہے ہیں، اس پر نظرِ ثانی نہ کی ہوتی۔ یہ حضرات مجھ سے کہیں زیادہ اقبال کے خیالات اور اسالیب کے سمجھنے والے ہیں۔ اس موقع پر ان کا شکریہ ادا کر کے مجھے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ترجمے کو بے قافیہ نظم میں ڈھالا گیا ہے—— اصل نظم مقفیٰ ابیات میں لکھی گئی ہے—— میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں مفہوم سختی سے اصل کے قریب رہے وہیں فارسیت کی شعری خوشبو بھی کسی قدر منتقل ہو جائے۔

(ڈاکٹر سلیم اختر— اقبال ممدوح عالم)